رجسٹرڈ ایس نمبر ۱۳۶۲

بانی: ماہر القادری

ماہنامہ فاران کراچی

اکتوبر ۱۹۸۳ء

مدیر: اسمٰعیل احمد مینائی

۲۱۸ - بہادر آباد، کراچی ٹیلیفون ۴۱۶۳۱۲

خوشحالی
آپ کی منتظر ہے
نیشنل بینک آف پاکستان
میں
شراکتی کھاتہ
شراکتی بچت کھاتہ
کم از کم ۱۰۰ روپے سے کھل سکتا ہے
شراکتی میعادی کھاتہ
بچت آپ کی ۔ محنت ہماری
نیشنل بینک آف پاکستان

بانی: مولانا ماہر القادری

ماہنامہ

فاران

کراچی

رجسٹرڈ ایس نمبر ــــــ ۱۲۶۲

اکتوبر ۱۹۸۲ء

جلد نمبر ــــــ ۳۴
شمارہ نمبر ــــــ ۱

ایڈیٹر
اسمٰعیل احمد مینائی

چندہ سالانہ :- پاکستان میں ــــــ ۵۰ روپے
" " :- بھارت و بنگلہ دیش میں ۱۰۰ روپے
" " :- دیگر ممالک میں ۲۰۰ روپے
قیمت فی پرچہ :- ۵/- روپے ۱۰۰ روپے

دفتر
ماہنامہ فاران نمبر ۲۱۸، بہادر آباد کراچی
فاران کا نیا شمارہ اور پرانے شمارے ملنے کا پتہ :-
۱:- صدر ریگل بکسٹال
۲:- محمد سعید، عوامی کتب خانہ بولٹن مارکیٹ نزد لکشمی بلڈنگ کراچی۔

اس شمارے میں

"قرآن کریم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپکی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کیجاتی ہیں انکا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہوں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔"

پبلشر اسمٰعیل احمد مینائی نے انجمن پریس کراچی سے چھپوا کر دفتر فاران نمبر ۲۱۸ بہادر کراچی سے شائع کیا۔ فون ۴۱۲۶۲۱۲

نقش اوّل

صرف سیاسی فضا ہی نہیں ملک کا ادبی ماحول بھی گھٹن اور گمرہی کا شکار ہے، بہت کچھ لکھا جا رہا ہے جو کاغذ سیاہ کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے اور بہت کچھ کہا جا رہا ہے جسکو بکواس کے علاوہ کسی اور لفظ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ نہ تحریر کی کوئی سمت ہے نہ تقریر کی کوئی جہت، مشاعرے بھی ہوتے ہیں، مذاکرے بھی ترتیب دیئے جاتے ہیں، نئی پرانی کتابوں کی صورت کی تقاریب بھی منعقد ہوتی ہیں، اور ان تمام ادبی مشاغل کی لمبی لمبی روئداد بھی روزناموں اور ہفت روزہ و ماہانہ رسائل میں شائع ہوتی ہیں لیکن نہ تقاریب میں شرکت و شمولیت سے کو فرحت ملتی ہے ذہن و فکر کو نہ ان کی روئدادیں پڑھ کر دل و دماغ پر کوئی صحت بخش تاثر قائم ہوتا ہے۔

ایسا کیوں ہے، اس بے تاثیری کا سبب کیا ہے، کیا تمام ادیبوں کی فکر "عقیم" ہو گئی ہے کیا سارے اہل قلم کے کلک تحریر روشنائی سے محروم ہو چکے ہیں عمل کے لحاظ سے تو قوم مفلس و محتاج تھی ہی، کیا سوچ بچار کے سوتے بھی خشک ہو گئے ہیں اور ملت بالکل تہی مایہ و تہی دامن ہے۔

نہیں، ہرگز ایسا نہیں ہے، دامن ملک و ملت آج بھی لعل و گہر سے لبریز ہے، قوم کے پیر و جوان اب بھی اسی استعداد اور صلاحیت سے بہرہ ور ہیں جس نے ہزار سال تک اس قوم ہی کے افراد کے ذریعے علمی و فکری دنیا کو فتح کی ہے پھر آخر کیا بات ہے جو یہ ملت آج سارے کرۂ ارضی پر ذلیل و خوار ہے، غریب اور غلام ہے جہاں جہاں مسلمان ہیں، مفلسی اور رسوائی کا نشان ہیں، بقول رشید صدیقی مرحوم

"ہر بلندی پر پیدین چیک اور ہر پستی پر سلام علیک" اس صورتِ حال کے چھوٹے موٹے سبب بہت سے ہوں گے، بے علمی، بداعمالی، نظم و ضبط کی کمی، خود غرضی، زر پرستی و آرام طلبی، دین سے بیگانگی، یہ سب باتیں اپنی جگہ صحیح ہوں گی اور صحیح ہیں لیکن اصلی علت بالکل صاف اور سادہ ہے اور وہ ہے سو جسے دیکھو امیر کارواں ہے۔

ملت کا ہر فرد اپنی جگہ ایک مکتبِ فکر بنا ہوا ہے نہ کسی کے علم و فضل پر بھروسہ ہے نہ کسی کے زہد و تقویٰ پر اعتماد ہے، خود رائی نے خود آگاہی کے تمام دریچے بند کر دیئے ہیں اور خود آگاہی کے فقدان نے خدا آگاہی کی منزل بہت دور پہنچا دی ہے جب تک خدا آگاہی نہ ہوگی، نہ منزل ملے گی نہ منزل کا پتہ ملے گا بلکہ راستہ بھی صرف

نظر آئے گا جب خود آگاہی کی فرصت کا شعور پیدا ہوگا اور یہ شعور بیدار ہوگا جب ذہن خود رائی کے خناس سے خالی ہو جائے گا۔

خود رائی ـــــ خودسری کا ہراول ہے اور اس وقت مسلم ممالک اور مسلم ملت کا سب سے بڑا مسئلہ یہی خودسری ہے، راعی اور حاکم خودسر ہیں، علماء اور فقہا خودسر ہیں رعایا خودسر ہے، عامۃ الناس خودسر ہیں۔ حاکموں اور حکمرانوں کی خودسری یہ ہے کہ ان کو نہ احکام دین کی پرواہ ہے نہ اسکے اوامر و نواہی کی پابندی ہے۔ اور نہ ان کے دل میں بزرگان دین و ملت کا کوئی وقار و وزن یا احترام باقی ہے ـــــ علماء و فقہا خودسری میں اس سے بھی آگے ہیں ان کے زمرے میں جتنے اکابر ہیں (اور فی زماننا اصاغر ہی کو اکابر سمجھا جانے لگا ہے) اتنے ہی گروہ ہیں اور ہر گروہ صرف اپنے اساتذہ و شیوخ کے آراء و افکار کی چار دیواری میں بند اور محدود ہے اور اس چار دیواری کے اندر بھی عالم و عامی کے درمیان اتنے پردے ڈال دیئے گئے ہیں اور ایسے حجابات حائل کر دیئے گئے ہیں کہ اصل تک نظروں کو جانے کا راستہ ہی نہیں ملتا ۔

جلوہ ترا پنہاں ہے ابھی چشم بشر سے
ہر ایک نے دیکھا ہے تجھے اپنی نظر سے

رعایا اور عوام کی خودسری تو ان سب سے بڑھی ہوئی ہے، وہ نہ حاکم کی اطاعت پر راضی ہیں نہ علماء و فقہا کی اصابت سے مطمئن اور کیونکر ہوں کہ راعی اور حاکم اب کسی دستور و آئین کے پابند نہیں چاہے وہ آسمانی ہو یا زمینی۔ علماء و فقہا کا کوئی ایک مرکز نہیں بلکہ جتنے مکتب ہیں اتنے مرکز اور ہر مکتب میں جو مرکز ہے اسکا ایک نیا اور مستقل مکتب ہے یہی رنگ شریعت میں ہے اور یہی حال طریقت میں ـــ رعایا اور عوام کو یہ تلقین کی گئی ہے کہ طاقت، اقتدار، اختیار، سب کا سرچشمہ تم ہو، تم جو چاہتے ہو وہی ہونا چاہیئے، جو مانگو گے وہی ملنا چاہیئے یہی تصور تمام فتنوں کی جڑ ہے اور یہی نظریہ جملہ فساد کی بنا۔ اور یہی خودسری ہر سہ طبقات کی ساری خرابیوں کا باعث و سبب ہے۔

آج کے ادیب، شاعر، مضمون نویس، کالم نگار اگر اس حقیقت کو پہچان لیں اور مان لیں اور اسی آگہی کے حوالے سے اپنی تخلیقات اور اپنے افکار کی سمت مقرر کریں اور اسکی جہت و حد متعین کریں تو موجودہ ادب کی بے اثری اور نامقبولیت بھی زائل ہو سکتی ہے اور ادیب و شاعر کے طبقے میں جو بیدلی اور بے راہ روی بڑھ رہی ہے اسکا مداوا بھی ہو سکتا ہے اور قوم و ملک کے دن بھی پھر سکتے ہیں، قوم و ملک ہی نہیں ملت مسلمہ کو اپنی کھوئی ہوئی منزل کا نشان بھی مل سکتا ہے ـــــــــــــــ

اسمٰعیل احمد مینائی
اکتوبر ۱۹۸۲ء

طالب ہاشمی

صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ا۔ حضرت عتبانؓ بن مالک انصاری

غزوۂ بدر (رمضان المبارک سنہ ۲ ہجری) کے کچھ عرصہ بعد کا ذکر ہے کہ ایک دن ایک نابینا شخص سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے۔ یہ صاحب اگرچہ نورِ بصارت سے محروم تھے لیکن ان کی پیشانی نورِ سعادت سے چمک رہی تھی اور چہرے پر ملکوتی جلال تھا۔

انہوں نے بارگاہِ رسالت مآبؐ میں عرض کی "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، میرے ماں باپ آپؐ پر قربان، آپؐ دیکھ رہے ہیں کہ میں نابینا اور معذور ہوں، کیا اس حالت میں اپنے مکان پر نماز پڑھ سکتا ہوں"

حضورؐ نے فرمایا "کیا تمہارے کانوں میں اذان کی آواز پہنچتی ہے؟"

انہوں نے عرض کیا۔ "ہاں یا رسولؐ اللہ"

ارشاد ہوا۔ "تو پھر مسجد میں آکر نماز پڑھا کرو۔"

ان صاحب نے فرمانِ نبویؐ کو حرزِ جان بنا لیا اور عمر بھر مسجد میں آکر پنجگانہ نماز ادا کرتے رہے۔ یہ صاحب رسولؐ جن کو نابینا اور معذور ہونے کے باوجود فرمانِ نبویؐ کا اس قدر پاس تھا، حضرت عتبانؓ بن مالک انصاری تھے۔

نسب نامہ یہ ہے عتبانؓ بن مالک بن عمرو بن عجلان بن زید بن غنم بن سالم بن عمرو بن عوف بن خزرج۔

حضرت عتبانؓ اپنے قبیلے کے سردار تھے اور نہایت نیک طینت تھے۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابھی مدینہ منورہ میں نزولِ اجلال نہیں فرمایا تھا کہ حضرت عتبانؓ کے کانوں میں توحید کی آواز پڑی انہوں نے بلا تامل اس پر لبیک کہا اور انصار کے سابقون الاولون کی صف میں شامل ہو گئے۔ جب حضورؐ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپؐ کا پرتپاک خیر مقدم کرنے والوں میں حضرت عتبانؓ بن مالک بھی شامل تھے۔ حضورؐ چند دن قبا میں

قیام فرمانے کے بعد خاص مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوئے تو اثنائے راہ میں بنو سالم کا محلہ آیا۔ حضرت عتبان رضؓ بن مالک اور حضرت عباس رضؓ بن عبادہ بنو سالم کے عمائدین میں سے تھے۔ ان دونوں نے آگے بڑھ کر حضورؐ کو اھلاً و سھلاً کہا اور قیام کے لئے اپنا مکان پیش کیا لیکن یہ سعادت حضرت ابو ایوب انصاری رضؓ کے مقدر میں لکھی جا چکی تھی اس لئے حضورؐ انہیں دعائیں دیتے آگے روانہ ہو گئے۔

ہجرت کے چند ماہ بعد رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین اور انصار کے مابین عقدِ مواخاۃ قائم کرایا تو حضرت عتبان رضؓ بن مالک کو سیدنا حضرت عمر فاروق رضؓ کا دینی بھائی بنایا۔ ان دونوں بھائیوں میں عمر بھر رشتۂ خلوص و مودت قائم رہا۔

رمضان المبارک سنہ ۲ھ میں حق و باطل کا معرکۂ اول بدر کے میدان میں پیش آیا تو حضرت عتبان رضؓ بن مالک نے اس میں والہانہ جوش و خروش سے حصہ لیا اور مشرکین کے خلاف بڑی پامردی سے دادِ شجاعت دی۔

غزوۂ بدر کے بعد حضرت عتبان رضؓ کی آنکھیں خراب ہونا شروع ہوئیں جو کچھ مدت بعد بالکل جاتی رہیں اور وہ نابینا ہو گئے اسی لئے بدر کے بعد پیش آنے والے غزوے میں شریک نہ ہو سکے۔

حضرت عتبان رضؓ بارگاہِ نبوتؐ میں درجۂ تقرب رکھتے تھے اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بنو سالم کی مسجد کا امام مقرر فرمایا تھا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ حضورؐ نے امامت کے انتخاب کے لئے یہ اصول مقرر فرمائے تھے۔

ا:۔ جو سب سے زیادہ کلام اللہ پڑھا ہو۔
اگر اس میں سب برابر ہوں تو

ب:۔ جو سنت سے سب سے زیادہ واقف ہو۔
اگر اس میں بھی مساوات ہو تو

ج:۔ جس نے پہلے ہجرت کی ہو۔
اگر اس میں بھی سب برابر ہوں تو

د:۔ جس کی عمر سب سے زیادہ ہو۔

حضورؐ کا حضرت عتبان رضؓ کو امامت کے لئے منتخب فرمانا، بلاشبہ ان کی جلالتِ قدر کا بین ثبوت ہے۔

حضرت عتبان رضؓ کو فیضانِ نبویؐ سے بہرہ یاب ہونے کا بے پناہ شوق تھا چونکہ ان کا مکان کاشانۂ رسالت اور مسجدِ نبویؐ سے دو تین میل کے فاصلے پر تھا اور روزانہ آنے جانے میں دقت ہوتی تھی اس لئے انہوں نے

نے باہم اتفاق حضرت عمر فاروقؓ سے یہ طے کیا کہ دونوں باری باری رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا کریں۔ چنانچہ ایک دن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ دن بھر بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر رہتے اور احکام وحی اور ارشاداتِ نبویؐ سے اپنا دامن بھرتے رہتے۔ شام کو یہ تمام گہرہائے مقدس حضرت عتبان رضی اللہ عنہ تک پہنچا دیتے۔ دوسرے دن حضرت عتبانؓ بارگاہِ نبویؐ میں حاضر ہوتے اور اپنا دامن قرآن و حدیث کے گہر ہائے تابدار سے بھر کر لے جاتے اور حضرت عمر فاروقؓ تک پہنچا دیتے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عتبان رضی اللہ عنہ کے مکان اور مسجد کے درمیان ایک نشیبی جگہ (وادی) تھی۔ بارش ہوتی تو تمام پانی وہاں جمع ہو جاتا تھا۔ نظر کی خرابی کی وجہ سے حضرت عتبان رضی اللہ عنہ کے لئے اس پانی میں سے گزر کر مسجد تک پہنچنا سخت مشکل تھا اس لئے وہ ایسی صورتِ حالات میں گھر میں نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔

ایک دن انہوں نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ "یا رسول اللہؐ جب کبھی بارش ہوتی ہے تو مسجد اور میرے مکان کے درمیان گہرا پانی کھڑا ہو جاتا ہے۔ میری نظر اس پانی سے گزر کر مجھے مسجد تک پہنچنے کی اجازت نہیں دیتی اس لئے مجبوراً ایسی حالت میں گھر میں نماز ادا کر لیتا ہوں اگر کسی دن حضورؐ میرے ہاں قدم رنجہ فرما کر نماز پڑھا دیں تو اسی جگہ کو سجدہ گاہ بنالوں۔"

حضورؐ نے فرمایا۔ "بہت اچھا، میں آؤں گا۔"

دوسرے دن سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی معیت میں حضرت عتبانؓ کے گھر تشریف لے گئے اور ان سے پوچھا کہ تم کہاں نماز پڑھنا چاہتے ہو۔ انہوں نے وہ مقام جہاں بارش کے دنوں میں ہمیشہ نماز پڑھتے تھے بتادی۔ حضورؐ نے وہیں دو رکعتیں ادا کیں۔ اس کے بعد کچھ دیر وہاں تشریف فرما رہے۔ حضرت عتبانؓ نے حضورؐ کی خدمت میں بھنا ہوا گوشت پیش کیا۔ آپؐ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہمراہ اسے تناول فرمایا اور واپس تشریف لے گئے۔

اس واقعہ کے بعد حضرت عتبان رضی اللہ عنہ نے نابینائی کے عذر پر حضورؐ سے گھر پر نماز پڑھنے کی اجازت مانگی لیکن حضورؐ نے اس بناء پر ان کی درخواست کو شرفِ پذیرائی نہ بخشا کہ ان کے

کانوں تک اذان کی آواز پہنچتی تھی۔

مسند احمد بن حنبل میں ہے کہ خادم رسول اللہؐ حضرت انسؓ بن مالک حضرت عتبان رضی اللہ عنہ کے مکان والے واقعے کو کنوزِ حدیث میں شمار کرتے تھے اور اپنے بیٹے ابوبکرؒ کو تاکید کیا کرتے تھے کہ اسے یاد رکھیں۔

حضرت عتبانؓ آخر عمر تک مسجد بنو سالم کی امامت کرتے رہے۔ صحیح بخاری میں محمود بن ربیع سے روایت ہے کہ میں (۵۲ھ میں بعہد امیر معاویہؓ غزوہ قسطنطنیہ سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ آیا تو حضرت عتبانؓ بن مالک کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت وہ بہت ضعیف العمر ہو چکے تھے، نابینا تھے اور اپنی مسجد کی امامت کرتے تھے۔

حضرت عتبان رضی نے ۵۲ھ کے بعد ہی کسی وقت سفر آخرت اختیار کیا۔

حضرت عتبانؓ بن مالک کا شمار فضلاء صحابہ میں ہوتا ہے۔ ان سے مروی متعدد احادیث صحیحین، مسند احمد بن حنبل اور مسند ابو داؤد میں موجود ہیں۔ ان کے راویان حدیث میں حضرت انسؓ بن مالک، ابوبکرؓ بن انسؓ اور محمود بن ربیع کے اسماء گرامی قابل ذکر ہیں۔

اہل و عیال کے بارے میں کتب سیر خاموش ہیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۲: حضرت سعدؓ بن حبتہ بجلی

غزوہ احزاب (۵ھ) مسلمانوں کے لئے بہت بڑا امتحان تھا لیکن ان کا ہر مرد اور عورت، بوڑھا جوان اور بچہ اس امتحان میں پورا اترا اور اپنی عزیمت و استقامت اور صبر و استقلال کے ایسے نقوش صفحۂ تاریخ پر ثبت کئے جو ابد الآباد تک فرزندان توحید کے لئے مشعل راہ بنے رہیں گے۔ اسی غزوہ میں پندرہ برس کی عمر کے ایک نوجوان اس جوش اور جذبے کے ساتھ لڑے کہ لوگ دنگ رہ گئے۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کی شجاعت اور جذبۂ فدویت کی تحسین فرمائی اور پاس بلا کر پوچھا، تمہارا کیا نام ہے؟ انہوں نے اپنا نام بتایا تو حضورؐ نے فرمایا۔

" اللہ تمہیں خوش نصیب کرے " پھر نہایت شفقت سے ان کے سر پہ اپنا دست مبارک پھیرا۔

رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے خوش نصیبی کی دعا لینے والے یہ سعادت مند نوجوان حضرت سعدؓ بن حبتہ تھے۔ (ابن اثیر)

حضرت سعدؓ جو ابن حبتہ کے نام سے مشہور ہیں، قبیلہ بجیلہ سے تھے اور بنی عمرو بن عوف کے حلیف تھے۔ نسب نامہ یہ ہے:۔

سعدؓ بن بجیر بن معاویہ بن نفیل بن سدوس بن عبد مناف بن ابی اسامہ بن لحمہ بن سعد بن

عبداللہ بن کنانہ بن معاویہ بن زید بن غوث بن انمار بن اراش۔

حضرت سعدؓ کے والد بجیر نے اسلام کا زمانہ نہیں پایا البتہ ان کی والدہ حبتہؓ بنت مالک اسلام لائیں اور شرف صحابیت سے بہرہ ور ہوئیں وہ اوس کے خاندان عمرو بن عوف سے تھیں۔ حضرت سعدؓ انہی کے نام کی نسبت سے ابن حبتہ مشہور ہوئے۔ جس زمانے میں ان کی والدہ نے اسلام قبول کیا وہ کمسن تھے تاہم ماں کے ساتھ ہی شرف ایمان سے بہرہ ور ہو گئے۔

حافظ ابن عبدالبرؒ کا بیان ہے کہ ابن حبتہ بدر اور اُحد میں کم عمری کی بنا پر شریک نہ ہو سکے۔ غزوۂ خندق میں ان کی عمر پندرہ برس کی ہو گئی تھی اسلئے حضورؐ نے لڑائی میں شریک ہونے کی اجازت دے دی۔ خندق کے بعد وہ دوسرے غزوات و مشاہد میں بھی حضورؐ کے ہم رکاب رہے۔

ابن حبتہؓ ایک بہادر سپاہی اور نہایت اچھے شہسوار تھے۔

حافظ ابن حجرؒ نے "اصابہ" میں لکھا ہے کہ ۶ھ میں صلح حدیبیہ کے بعد عیینہ بن حصن فزاری نے مدینہ سے چند میل دور ایک چراگاہ (غابہ) پر چھاپہ مارا اور حضورؐ کی اونٹنیوں کو ہانک کر لے چلا۔ اتفاق سے مشہور صحابی حضرت سلمہؓ بن الاکوعؓ اور ایک دوسرے صاحب رسول ادھر آنکلے۔ حضرت سلمہؓ نے پہلے تو اپنے ساتھی کو اس واقعہ کی خبر دینے مدینہ روانہ کیا اور پھر ایک ٹیلے پر چڑھ کر یا صباحاہ (ائے صبح کی مصیبت) کا نعرہ لگایا اس کے بعد اکیلے ہی فزاری غارت گروں کے مقابلے پر ڈٹ گئے۔ عرب "یا صباحاہ" کا نعرہ اس وقت لگایا کرتے تھے جب وہ کسی مصیبت میں پھنس جائیں اور مدد چاہتے ہوں۔

حضرت سلمہؓ کے نعرے کی آواز سب سے پہلے بنو عمرو بن عوف کے محلے میں پہنچی۔ وہاں سے حضرت ابو قتادہؓ اور ابن حبتہؓ گھوڑوں پر سوار ہو کر آناً فاناً حضرت سلمہؓ کی مدد کو پہنچ گئے اور لٹیروں کو اپنے نیزوں پر رکھ لیا اسی اثنا میں کچھ اور سوار بھی پہنچ گئے جو حضورؐ نے مدینہ سے روانہ کئے تھے ان جوانمردوں نے لٹیروں کو بھاگنے پر مجبور کر دیا حضرت سلمہؓ نے ان کا دور تک تعاقب کیا اور حضورؐ کے اونٹ واپس لے آئے۔

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت سعدؓ بن حبتہ مدینہ منورہ ہی میں مقیم رہے البتہ جب حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں کوفہ آباد ہوا تو انہوں نے کوفہ میں بود و باش اختیار کر لی اور وہیں چند سال بعد سفر آخرت اختیار کیا۔ حضرت زیدؓ بن ارقم نے نماز جنازہ پڑھائی اور اسلام کے اس گوہر آبدار کو سرزمین کوفہ میں سپرد خاک کر دیا۔

حضرت سعدؓ بن حبتہ نے اپنے پیچھے چار اولادیں چھوڑیں تین لڑکے اور ایک لڑکی۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے جلیل القدر شاگرد حضرت امام ابویوسفؒ حضرت سعدؓ بن حبتہ ہی کی اولاد سے تھے۔

حضرت سعدؓ بن حبتہ سے مروی چند احادیث بھی کتابوں میں موجود ہیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

عبدالرشید عراقی

قاضی القضاۃ امام ابو یوسف رح

۱۱۳ھ تا ۱۸۲ھ

حضرت امام ابو یوسف کا شمار ائمہ احناف کے اساطین میں ہوتا ہے - آپ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے - امام ابو یوسف ؒ —— بحیثیت ایک فقیہہ ممتاز حیثیت کے حامل ہیں -
ان کے علم و فضل کا سب سے وسیع میدان یہی ہے - اسی (فقہ) میں انہوں نے تمام علوم سے زیادہ اپنی جودت طبع اور جولانی فکر کا ثبوت دیا ہے - اور فقیہہ ہی کی حیثیت سے دنیا ان کو جانتی ہے - آپ کے استاد محترم حضرت امام ابو حنیفہ ؒ فرمایا کرتے تھے -

"ابو یوسف فقہ اصحابی، میرے اصحاب میں سب سے زیادہ فقیہہ ہیں ۔"

امام ابو حنیفہ ؒ کے علاوہ دیگر اساطین علم نے انکا فقہ میں بھی ممتاز حیثیت کا اعتراف کیا ہے - امام علی بن صالح نے ان کو افقہ الفقہا اور سید الفقہا کہا ہے ۔ اور امام یحییٰ بن معین کہا کرتے تھے کہ

" امام ابو یوسف ؒ اہل عراق میں سب سے زیادہ افقہ تھے ۔"

امام ابو یوسف ۱۱۳ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے بعض ارباب سیر نے ۹۳ھ لکھا ہے [1] لیکن زیادہ تر مورخین کا ۱۱۳ھ پر اتفاق ہے -

آپ کا نام نامی یعقوب بن ابراہیم بن حبیب انصاری ہے -

آغازِ تعلیم آپ شروع میں بڑے غریب تھے - محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتے تھے - لیکن ادھر شوق علم بھی دامن گیر تھا - اس لئے علماء کی خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ بھی کرتے تھے - چنانچہ حصول معاش کے ساتھ ساتھ آپ نے حصولِ علم کی طرف بھی توجہ دینی شروع کی - کوفہ اُن دنوں علم و فضل کا ایک بہت بڑا مرکز تھا -

---

[1] ابو القاسم علی بن محمد السمعانی م ۴۹۹ھ تبع تابعین ج ۱ ص ۱

امام محمد بن ابی لیلیٰ اور امام ابو حنیفہؒ کی مجالس درس کو خاص امتیاز حاصل تھا۔ چنانچہ امام صاحب نے پہلے امام ابن ابی لیلیٰ کی مجلس میں حاضری دینی شروع کی اور اکتساب علم شروع کیا۔ اور امام صاحب سے تقریباً ۸۔۹ برس تک کسب فیض کرتے رہے۔ اس کے بعد آپ نے حضرت امام ابو حنیفہؒ کی مجلس درس میں جانا شروع کیا۔ اور آپ سے استفادہ شروع کیا۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ کو جب آپ کی مالی حالت کا پتہ چلا۔ تو انہوں نے آپ کی مالی مدد بھی کرنی شروع کی۔ اور اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ آپ علم ہی کے ہو کے رہ گئے۔

جیسا کہ پروفیسر ابو زہرہ مرحوم لکھتے ہیں۔

"جب امام ابو حنیفہؒ نے آپ کی یہ حالت دیکھی تو ان کی مالی مدد کرنے لگے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ آپ علم ہی کے ہو کر رہ گئے۔ قبل ازیں آپ قاضی ابن ابی لیلیٰ کے شاگرد رہ چکے تھے۔" [۱۰]

امام صاحب حضرت امام ابو حنیفہؒ کی خدمت میں بسلسلہ تحصیل تعلیم ۲۹ برس تک رہے۔ لیکن بعض تذکرہ نویسوں نے یہ لکھا ہے۔ کہ آپ کی کل مدت تحصیل علم ۲۹ برس ہے۔ جس میں ۹ برس ابن ابی لیلیٰ کی خدمت میں اور ۲۰ برس حضرت امام ابو حنیفہؒ کی خدمت میں۔

امام صاحب کو طبعاً علم دین سے اتنا شغف تھا کہ معاش کی تنگی اور عسرت کی زندگی ان کی تحصیل علم کی راہ میں مانع نہ ہو سکی۔ اور اگر کہیں مانع ہوئی تو وہ معاشی حالت کی وجہ سے ہوئی۔ مگر آپ کی معاشی حالت کا حل آپ کے استاد محترم کے پاس تھا۔ یعنی وہ آپ کی گاہے بگاہے مالی مدد کرتے رہتے تھے۔

تحصیل علم کا شوق اتنا دامن گیر تھا کہ کسی صورت میں بھی حضرت امام ابو حنیفہؒ کے درس سے ناغہ نہیں کرتے تھے۔ ارباب سیر نے آپ کا ایک ایسا واقعہ نقل کیا ہے کہ جس کو پڑھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے۔ کہ دنیا میں ایسے بھی انسان گزرے ہیں کہ جو تحصیل علم کے شوق میں ایسا کام کر جاتے ہیں۔ کہ دنیا کے لئے ایک نمونہ بن جاتا ہے۔

مولانا حافظ مجیب اللہ ندوی نے تبع تابعین جلد اول میں نقل کیا ہے۔

کہ امام ابو یوسف خود فرماتے ہیں۔

"میرے ایک بچے کا انتقال ہو گیا۔ لیکن میں اس کی تجہیز و تدفین میں شریک نہیں ہوا۔ اور اس کو اپنے پڑوسیوں اور عزیزوں کی ذمہ داری پر چھوڑ دیا۔

---

[۱۰] حیات امام ابو حنیفہؒ ص ۲۲۱

کہ کہیں ایسا نہ ہو۔ کہ امام ابوحنیفہؒ کے درس کا کوئی حصہ چھوٹ جائے
اور مجھے اس کی حسرت رہ جائے"۔ (ص ۱۰)

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ ان کو علم دین سے کتنا ذوق اور شغف تھا۔ اور امام ابوحنیفہؒ کی مجلس درس ان کی نگاہ میں کیا قدر و قیمت تھی۔

استفادہ حدیث قاضی ابن ابی لیلیٰؒ اور امام ابوحنیفہؒ کی خدمت میں رہنے کے بعد کسی دوسرے صاحب کمال کے سامنے ان کو زانوئے تلمذ تہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

خود فرماتے ہیں!

"مجھے دنیا میں کوئی مجلس درس امام ابوحنیفہؒ اور ابن ابی لیلیٰ کی مجلس درس سے زیادہ محبوب نہیں ہے۔ اس لئے کہ نہ تو میں نے امام ابوحنیفہؒ جیسا بہتر فقیہہ دیکھا اور نہ ابن ابی لیلیٰ جیسا قاضی"!

(مناقب کردی ج ۲ ص ۲۱۵)

لیکن ہر استاد فن کی کچھ نہ کچھ خصوصیت ہوتی ہے۔ اس لئے متقدمین میں دستور تھا۔ کہ وہ زیادہ سے زیادہ [اسا]تذہ فن کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے کسب فیض کرتے تھے۔ امام صاحب کے اساتذہ حدیث کی فہرست بہت طویل [ہے]۔ اور آپ نے اپنی تصنیف "کتاب الخراج" میں اپنے اساتذہ حدیث کی فہرست دی ہے۔ تاہم چند ایک مشہور اساتذہ [حد]یث کے نام درج ذیل ہیں:۔

سفیان بن عیینہؒ۔ عمرو بن دینارؒ۔ امام مالک بن انسؒ۔ نافع مولیٰ ابن عمرؓ
ہشام بن عروہؒ۔ ہشام بن سعدؒ۔

حلقۂ درس تحصیل تعلیم اور آئمہ روزگار سے استفادہ کے بعد آپ نے اپنا ایک علیحدہ حلقۂ درس قائم کیا۔ اور آپ سے بے شمار لوگوں نے استفادہ کیا۔ اور ان کے چشمہ علم سے سیراب [ہو]ئے۔ اور آپ کے درس کا سلسلہ تقریباً ۱۶ سال تک یعنی ۱۵۰ھ تا ۱۶۶ھ تک جاری رہا۔

عہدہ قضاء عہد نبویؐ اور عہد صدیقیؓ میں عہدہ قضاء اسلامی حکومت کا کوئی الگ شعبہ نہیں تھا۔ بلکہ ہر صوبہ یا ضلع کا جو والی ہوتا تھا۔ وہی انتظامی اور عدالتی دونوں امور سرانجام [دیت]ا تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں جب اسلامی حدود و مملکت میں بہت زیادہ وسعت پیدا ہوئی۔ اور گوناگوں

مصالح اور ضرورتوں کی بنا پر انتظامیہ اور عدلیہ کو ایک ساتھ رکھنا مشکل ہو گیا تو حضرت عمرؓ نے دونوں شعبوں کو الگ کر دیا اور دونوں کے الگ الگ ذمہ دار اور سربراہ مقرر کئے۔ اس کے بعد دونوں شعبے ایک دوسرے سے آزاد ہو گئے۔ جن کے عہدہ داروں کا تقرر خود خلیفۂ وقت کرتا تھا۔

امام ابو یوسف ۱۶۶ھ میں خلیفہ مہدی کے دور میں عہدہ قضاء پر مامور ہوئے۔ آپ تین خلفاء یعنی مہدی، ہادی اور ہارون الرشید کے دورِ حکومت میں قاضی رہے۔ ابتداءً آپ کو خلیفہ مہدی نے بغداد کے مشرقی حصہ کا قاضی مقرر کیا۔ اور اسی پر آپ خلیفہ ہارون الرشید کے عہد حکومت میں ایک سال تک تعینات رہے۔ بعد میں ہارون الرشید نے آپ کو تمام ممالک محروسہ کا قاضی القضاۃ مقرر کر دیا۔

مقریزی نے لکھا ہے۔ کہ عراق، خراسان، شام، مصر میں ان کے حکم کے بغیر قضاۃ کے منصب پر کوئی مقرر نہیں ہو سکتا تھا [۱]

جواہر فقہ میں ہے:۔

"مشرق سے مغرب تک تمام اسلامی ملکوں میں قاضیوں کا تقرر انہی کے سپرد تھا" [۲]

خود امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں۔

فولّانی قضاء البلاد کلها [۳]

مجھ کو تمام ممالک محروسہ کی قضاۃ کی ذمہ داری سونپ دی۔

بحیثیت قاضی آپ نے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ وہ تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں اور تاریخ کے صفحات اس سے بھرے ہیں کہ آپ نے فیصلے میں کسی کی رعایت نہیں کی ہمیشہ وہی فیصلہ کیا جو قرآن و سنت کے مطابق ہوتا تھا۔ اور اسمیں خلیفۂ وقت کی بھی پرواہ نہیں کی ——— یہی وجہ ہے کہ خلیفہ ہارون الرشید جیسا باجبروت اور خود پرست خلیفہ ان کی عزت اور قدر کرتا تھا۔ اور جب ہارون کا ان سے سامنا ہوتا تھا۔ تو خود سلام میں سبقت کرتا۔

امام صاحب عہدۂ قضاء پر کتنی مدت تک رہے۔ اس میں مورخین کا اختلاف ہے۔ تاہم اس پر سب کا اتفاق

---

[۱] مقریزی ج ۴ ص ۱۸۱ [۲] ج ۲ ص ۲۲۱
[۳] موفق ج ۲ ص ۲۳۹

ہے۔ کہ آپ کے عہدہ قضا کی مدت ۲۲ برس سے کم نہیں ہے۔

محاسنِ اخلاق امام صاحب کا صحیفہ اخلاق ہر قسم کے محاسن و فضائل سے پُر ہے۔ عہدۂ قضاء پر رہتے ہوئے بھی آپ نے اعلیٰ اخلاق و کردار کا ثبوت دیا ہے۔ حالانکہ اس عہدے پر پہنچنے کے بعد بڑے بڑے پاکباز لوگوں کا دامن بھی آلودہ ہو جاتا ہے۔ مگر آپ نے کبھی بھی اپنا دامن داغ دار نہیں ہونے دیا۔

بچپن سے فقر و فاقہ کی زندگی تھی۔ لیکن بعد میں آپ کی مالی حالت بہت اچھی ہو گئی۔ چنانچہ آپ کافی رقم غرباء و مساکین میں تقسیم کرتے تھے۔ وفات کے وقت کافی رقم آپ کے پاس موجود تھی۔ جو آپ نے غرباء میں تقسیم کرنے کی وصیت کی۔ بہرحال آپ نہایت نرم خُو اور فیاض تھے نہایت پاک دامن اور عفت مآب تھے خود فرمایا کرتے تھے۔ کہ اے اللہ تو جانتا ہے کہ میں نے کبھی کوئی حرام فعل نہیں کیا۔ اور نہ حرام کا پیسہ کھایا۔

علم و فضل علم و فضل میں یگانہ حیثیت کے حامل تھے۔ اور ان کے صحیفۂ زندگی کا سب سے جلی عنوان یہی ہے۔ قرآن، حدیث اور فقہ میں کامل طور رکھتے تھے۔ قرآن پر غور و فکر اور اس سے نتائج اخذ کرنے کے لئے حدیث و آثار کے علاوہ لغت عرب اور بعض دوسرے علوم سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ چنانچہ امام ابو یوسفؒ ان تمام علوم کے جامع تھے۔ جن کی ضرورت ایک مجتہد کے لئے ضروری ہے۔

قرآن سے ان کے استدلال و استنباط کی ایک مثال پیش خدمت ہے۔

واعلموا انما غنمتم من شیٔ فان اللہ خمسہٗ (الانفال - ۴۱)

جان لو کہ بے شک جو تم مال غنیمت حاصل کرو اس میں پانچواں حصہ اللہ اور رسولؐ اور ذوی القربیٰ کا ہے۔

یہ آیت غنیمت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔ کہ اس میں ⅕ لوگوں کا حصہ ہے جن کا ذکر قرآن میں موجود ہے اور ⅘ فوج کا ہے۔ اور فوج میں وہ لوگ شامل نہیں ہیں۔ جو باقاعدہ حکومت کے ملازم ہیں۔ یا ان کو حکومت نے مقرر کیا ہو۔ بلکہ اسمیں وہ لوگ بھی حصہ دار ہوں گے جو رضا کارانہ شریک جہاد ہوتے ہیں۔

حدیث و آثار میں ان کی حیثیت امام کی تھی۔ امام ذہبیؒ نے انکو حفاظِ حدیث کے چھٹے طبقہ میں شمار کیا ہے۔ جن میں یحییٰ بن معینؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام عبداللہ بن مبارکؒ اور سفیان بن عیینہؒ وغیرہ شامل ہیں۔ مگر بعض محدثین نے آپ کی روایت کردہ حدیث کو قبول نہیں کیا۔

پروفیسر ابوزہرہ مصری مرحوم لکھتے ہیں۔

"منصب قضاء پر فائز ہونے کی وجہ سے بعض محدثین آپ کی روایت کردہ حدیث قبول نہیں کرتے تھے۔ عدم قبول روایت کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ کہ آپ کا شمار ان فقہا میں ہوتا تھا جن پر رائے کا غلبہ تھا۔ اسی لئے مورخ طبری کو لکھنا پڑا۔

"اہلحدیث کی ایک جماعت آپ کی حدیث کو اس لئے قبول نہیں کرتی تھی کہ آپ کی رائے کا غلبہ تھی۔ مسائل و احکام سے فروعات کا استنباط کرتے تھے۔ مزید برآں صحبت سلطان اور منصب قضاء پر فائز ہونا بھی اس کا ایک سبب تھا۔" [۱]

مگر اس کے ساتھ ساتھ کہنا بھی پڑتا ہے۔ کہ امام ابویوسف امام صاحب کے اصحاب میں سب سے زیادہ حدیث داں تھے۔ لیکن ان کا اصول یہ تھا۔ کہ وہ تحدیث روایت کو بغیر درایت کے صحیح نہیں سمجھتے تھے۔

فقہ ان کا تمام علوم سے زیادہ وسیع علم ہے اس میں انہوں نے تمام علوم سے زیادہ جودت طبع اور جولانی فکر کا ثبوت دیا ہے۔ اور فقیہہ ہی کی حیثیت سے دنیا اُن کو جانتی ہے۔ اور فقہ حنفی کو امام ابویوسف کے طفیل لاتعداد فوائد حاصل ہوئے۔ اصول فقہ کی تدوین بھی آپ کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اصول فقہ کی تدوین اس سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔ آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس فن کو باقاعدہ مدون کیا۔ فقہ حنفی کی جس کتاب کو بھی اٹھا کر دیکھئے اس میں امام ابویوسف کے اقوال، مجتہدات اور استنباطات ملیں گے۔ اور بقول پروفیسر ابوزہرہ مرحوم فقہاء الرائے میں سے آپ اولین فقیہہ تھے۔

وفات

سنہ ۱۸۲ھ میں آپ نے انتقال کیا۔ خلیفہ ہارون الرشید نے آپ کی وفات کو ایک بہت بڑا المیہ قرار دیا۔ خلیفہ نے خود نماز جنازہ پڑھائی اور اپنے خاندان کے خاص مقبرہ میں دفن کرایا [۲]

اہل تذکرہ نے لکھا ہے کہ امام ابویوسف کے جنازہ میں ابو یعقوب خزیمی شاعر بھی شریک تھا۔ اس نے لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ فقہ کا خاتمہ ہو گیا۔ تو اُس نے برجستہ ایک مرثیہ کہا۔ جس کے چند اشعار

---

[۱] حیات امام ابوحنیفہ ص ۲۲۱ [۲] تاریخ بغداد ج ۱۴

یہ ہیں :-

یا ناعی الفقہ الی اہلہ
ان مات یعقوب وما تدری
لم یمت الفقہ ولکنہ
حول من صدر الی صدر
القاہ یعقوب ابی یوسف
فزال من ظہر الی ظہر
فہو مقیم فاذا ما ثوی
حل وحل الفقہ فی قبر [۱]

تصانیف

امام ابو یوسفؒ ان بزرگوں میں سے ہیں جنہوں نے ابتدائی صدیوں میں علوم دینیہ کی تدوین میں حصہ لیا تھا۔ بلکہ بعض فنوں کی تدوین میں انہیں اولیت حاصل ہے۔ ان کا شمار کثیر التصانیف علماء میں ہوتا ہے۔
صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے۔ کہ آپ کی امالی تین سو مجلدات میں تھیں۔ تاہم آپ کی جن تصانیف کا پتہ ملتا ہے۔ اُن کی فہرست پیش خدمت ہے۔

(۱) کتاب الصلوٰۃ۔ (۲) کتاب الزکوٰۃ (۳) کتاب الصیام (۴) کتاب الفرائض (۵) کتاب البیوع (۶) کتاب الحدود (۷) کتاب الوکالۃ (۸) کتاب الوصایا (۹) کتاب الصید و الذبائح (۱۰) کتاب الغصب و الاستبراء (۱۱) کتاب اختلاف الامصار (۱۲) کتاب الرد علی مالک بن انسؒ (۱۳) مسائل خراج پر مشتمل ایک مکتوب بنام ہارون الرشید (۱۴) کتاب الجوامع۔ (۱۵) کتاب الآثار (۱۶) اختلاف ابن ابی لیلیٰ۔ (۱۷) الرد علی سیر الاوزاعی۔ (۱۸) کتاب الخراج۔

چند مشہور کتابوں کا مختصر تعارف

۱:- کتاب الآثار :- اس کتاب میں وہ احادیث و آثار جمع کر دیئے ہیں۔ جو حنفی مسلک سے ماخذ ہیں

---

[۱] تبع تابعین ج ۱ ص ۴۷

اس میں انہوں نے وہ تمام روایات لی ہیں جو امام ابوحنیفہ سے مروی ہیں دوسرے لفظوں میں گویا یہ مسند امام ابوحنیفہ
اس کتاب کو فقہی ابواب کے مطابق ترتیب دیا گیا ہے۔ اور اسمیں احادیث و آثار کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ
اور اس کتاب میں امام ابوحنیفہ رح کے علاوہ دوسرے فقہائے عظام کی بھی اقوال درج ہیں

پروفیسر ابوزہرہ مصری مرحوم اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"یہ کتاب امام ابوحنیفہ رح کے علاوہ دوسرے فقہاء کے اقوال کی بھی جامع ہے۔ لہذا اس کے مطالعے سے وہ پورا ماحول ہماری نگاہ کے سامنے پھر جاتا ہے جس میں آپ نے فقہی مسائل استنباط کئے۔ اور ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ اپنے پیش روؤں میں امام کو کیا مرتبہ حاصل تھا۔ اور عام مجتہدین میں آپ کیا مقام رکھتے تھے۔" لـه

یہ کتاب لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ حیدر آباد دکن نے شائع کی ہیں اور اس پر مولانا ابوالوفا افغانی صاحب کے مفید حواشی بھی ہیں۔

۲:- کتاب اختلاف ابی حنیفہ و ابن ابی لیلیٰ

امام ابویوسف نے قاضی ابن ابی لیلیٰ اور امام ... سے اکتساب فیض کیا۔ امام ابوحنیفہ رح اور ... ابن ابی لیلیٰ میں بہت سے فقہی مسائل میں اختلاف تھا۔ اس کتاب میں امام ابویوسف نے اپنے ان دونوں اساتذہ ... اختلافات کو کتابی شکل میں جمع کر دیا ہے اس کتاب میں امام ابویوسف نے بیسیوں جگہ امام ابوحنیفہ رح سے اختلاف ... اور ابن ابی لیلیٰ کی رائے کو ترجیح دی ہے۔ اور بعض جگہ دونوں اساتذہ سے اختلاف کیا ہے۔ یہ کتاب ان دونوں ... کے مجتہدات کے ساتھ امام ابویوسف کے مجتہدات اور استنباطات کا بھی بہترین نمونہ ہے یہ کتاب احیاء المعارف النعمانیہ ... حیدر آباد دکن سے شائع ہو چکی ہے۔

۳:- کتاب الرّد علی سیر الاوزاعی

اس کتاب میں امام ابویوسف رح امام اوزاعی کے ان ... کی تردید کرتے ہیں۔ جن میں وہ امام ابوحنیفہ رح کے ... ان مسائل کا تعلق زیادہ تر احکام جنگ اور ان سے متعلق مسائل امان صلح، اور اسلاب و غنائم سے ہے۔ ان مسائل ... آپ نے امام ابوحنیفہ رح کی حمایت کی ہے۔ اور امام اوزاعی رح سے اختلاف کیا ہے۔ اور اس کتاب کے مطالعہ سے امام ابو ... کی دقت نظری اور امام ابوحنیفہ رح کی سیر و مغازی سے پوری واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ کتاب بھی حیدر آباد ...

لـه حیات امام ابوحنیفہ رح ص ۳۲۷

گئی ہے۔

۴:۔ کتاب الخراج

کتاب الخراج امام ابو یوسف رح کی سب سے اہم کتاب ہے۔ "الخراج" اسلامی ریاست کا ایک شعبہ آمدنی ہے۔ مگر یہ لفظ امام ابو یوسف نے تقریباً اسلامی مالیات تمام مداخل و مخارج کے لئے استعمال کیا ہے۔ جن کا تعلق حکومت یا مسلمانوں کی اجتماعی زندگی سے ہے۔

اس کتاب کی تصنیف کا پس منظر پروفیسر ابوزہرہ مصری مرحوم نے یہ لکھا ہے کہ:۔

> کتاب الخراج قاضی ابو یوسف رح کا ایک خط ہے۔ جو انہوں نے خلیفہ ہارون الرشید کے نام لکھا ہے۔ اس میں وہ حکومت کے مالی رسائل اور ذرائع آمدنی کی تفصیلات کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کا زیادہ اعتماد قرآنی دلائل، احادیث نبویہ ؐ اور صحابہ کرام رض کے فتاویٰ پر ہے۔ وہ احادیث روایت کر کے ان سے علل کا استنباط اور صحابہ رض کے ان پر عمل کا ذکر کرتے ہیں۔ اور ان کے اقوال سے ان کے افعال کا مبنیٰ نکا لتے ہیں اور جب قیاس و رائے میں صحابہ رض کی مخالفت کرتے ہیں۔ تو اسے علل پر مبنی قرار دیتے ہیں۔ (حیات امام ابو حنیفہ رح ص ۳۲۳)

اس کتاب میں امام ابو یوسف رح نے جس جرأت اور حق گوئی کا اظہار کیا ہے۔ اور ہارون الرشید کو جو نصیحتیں کی ہیں اس کا اندازہ اس کتاب کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ عباسی خلفاء اور خصوصیت سے ہارون الرشید کی خود رائی اور ان کے استبداد کی تاریخ کو بھی سامنے رکھا جائے۔ تو امام صاحب کی جرأت اور حق گوئی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ کتاب بلاشبہ اپنے موضوع پر بہتر اور قیمتی فقہی سرمایہ ہے۔

یہ کتاب کئی بار چھپی ہے۔ سب سے پہلے مطبع بولاق مصر سے ۱۳۰۲ھ ۱۸۸۴ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کا فرانسیسی زبان میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ اور ۱۹۲۹ء میں پیرس سے شائع ہو چکی ہے۔

قطعات

حضرت عرشی

(۱)

صابر بہ بلائے خویش گرداں یارب
شاکر بہ عطائے خویش گرداں یارب
از عرشیؔ ناتواں دعائے بہ پذیر
راضی برضائے خویش گرداں یارب

(۲)

سارباں ناقہ راں بجانب نجد
کز در بام اُو بخیزد وجد
اَینما یرکعو القمرَ والشمس
اَینما یسجد العُلیٰ والمجد

حضرت عرشی

عُمرے کا سفر

علامہ محمد حسین عرشی امرتسری ثم لاہوری کا نام نامی، علم و ادب کی دنیا میں ایسا معروف و معتبر ہے کہ احقر جیسے گمنام و گوشہ نشین، ہیچمیرز و ہیچمداں کا ان کی کسی تحریر پر توصیفی یا تعارفی نوٹ رقم کرنا ایک ناقابلِ معافی جسارت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے، اتنا عرض کرنا البتہ ناگزیر ہے کہ حضرت محترم نے "یہ سفرنامۂ عمرہ" جب فاران کو عطا فرمایا تو مدیر فاران کو بھی بندۂ بے دام بنا لیا، تبلیغ و تبلیغ کے حضرت محترم فی زمانا امام ہیں امام! اور اس تحریر میں بھی اسی شغل کی روح کارفرما ہے —————— اسمٰعیل احمد مینائی

آغازِ سفر سفرنامہ لکھنا ایک فن کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اور میں اس فن کا ماہر نہیں ہوں۔ زیادہ سچی بات یہ ہے کہ میں کسی فن کا بھی ماہر نہیں ہوں۔ صورتِ حال یہ ہے کہ ؎

"تری بندہ پروری سے مرے دن گذر رہے ہیں۔" (اقبالؔ)

مشکلات:- مغربی ممالک کے برعکس ہمارے ملک کی یہ خصوصیت ہے کہ حکومتی دفاتر سے کوئی بھی کام لینا ہو تو اس میں قسم قسم کی مشکلات پیش آئیں گی۔ جو خود اہلِ دفاتر کی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔ جب کہ مغربی اہل کار اپنے عوام کے معاون ہوتے ہیں۔ یہاں عوام کی کھال اتارنا معمول ہے۔

پاسپورٹ بنوانے کے لئے یونٹ دباغ (لاہور) سے پاسپورٹ آفس تک جانے کا رکشا کا کرایہ بیس روپے اور پھر واپسی کے بھی اتنے ہی روپے۔ اگر کسی سفارش یا رشوت کی 'برکت' سے دو پھیروں میں کام بن گیا تو اسی روپے کا یہ خرچ کسی حساب میں نہیں۔

اس کے بعد ویزا کے لئے اسلام آباد حاضری لازم ہے۔ اس پر بھی کئی دن صرف ہوئے۔ راجہ فتح خاں صاحب

برکن انجمن فیض الاسلام) نے صاحب فراش ہونے کے باوجود بخوشی مدد کی - اور یہ مشکل حل ہوئی - راولپنڈی سے بذریعہ
طیارہ واپسی کا ٹکٹ بنوایا - روانگی راولپنڈی سے اور واپسی کراچی تک۔

۲۹ اپریل کی شام ارکان انجمن کا ایک چھوٹا سا قافلہ طیارہ گاہ تک پہنچانے میں معاون ہوا یہ میرا پہلا ہوائی سفر تھا جو بخیر و خوبی انجام پذیر ہوا - جہاز کے عملے کی صفائی ستھرائی - تہذیب شائستگی نے خاصا متاثر کیا - ہر مسافر کی ہر ضرورت کا خیال رکھتے ہیں - چائے - کافی - سوڈا واٹر - ناشتہ وغیرہ سب کچھ معقول مناسب اور شائستہ ہے۔

ریل کا محکمہ :- "خدا کرے کہ ملے ریل کو بھی یہ توفیق"

ہمارے ملک میں ریل کا محکمہ دوسرے کئی محکموں کی طرح ایک لاعلاج کوڑھ بن گیا ہے مسافروں کو (وہ کسی بھی درجے کے مسافر ہوں) طرح طرح کی تکالیف سے دوچار ہونا پڑتا ہے خداوندان محکمہ سب کچھ جانتے ہیں لیکن ازالہ تکالیف کا کوئی اہتمام اپنا فرض نہیں سمجھتے ریلوے کے محکمے کی کوئی کل سیدھی نہیں سہ

اونٹ بے چارہ زمانے میں عبث بدنام ہے
آہ اونٹ۔ —— آہ ریل۔

کراچی - راولپنڈی سے کراچی تک کوئی ڈیڑھ گھنٹے کا ہوائی سفر آرام سے گزرا - طیارہ گاہ سے نکلا تو پیری مخدوم پروفیسر عبدالرشید فاضل صاحب لینے کو تشریف لائے ہوئے تھے - ان کو دیکھتے ہی دولت اطمینان میسر آئی - ان کے ساتھ ہی حافظ رحمت الہیٰ دہلوی صاحب عزیزم عبدالحق صاحب (لائبریرین جناب خالد اسحق صاحب ایڈووکیٹ) اور سردار ابراہیم صاحب (ماسٹر کریم بخش صاحب کے فرزند) - محمد اقبال صاحب (ایم - اے بٹلہ والے کے نمائندے) موجود تھے - گاڑی میں بیٹھے اور بٹلہ صاحب کی کوٹھی واقعہ بہادر آباد پہنچے - قریباً دو گھنٹے تک یہاں مجلس رہی - ماسٹر کریم بخش صاحب بٹلہ صاحب کے ساتھ منتظر بیٹھے تھے - قہوے کا دور چلا - آئندہ کے لئے پروگرام طے ہوا اور ڈرائیور نے سب اصحاب کو ان کے ٹھکانوں پر پہنچا دیا - راقم کی رات محمد اقبال صاحب کے ساتھ بندر روڈ پر بٹلہ صاحب کے نئے دفتر میں گزری صبح اذان سے پہلے کراچی کے طیارہ گاہ کی طرف روانگی ہوئی - محمد اقبال صاحب نے طیارے پر سوار ہونے سے پہلے کی محکمانہ کارروائی میں پوری تن دہی سے مدد کی - ساڑھے سات بجے ۳۰ اپریل کو جدہ کے لئے روانگی ہوئی - عملے کی شائستگی سے متاثر ہوتا اور ریلوے والوں کی مجرمانہ نالائقی پر دل ہی دل میں کڑھتا ہوا منازل سفر طے کرتا رہا —— دہران پر طیارہ بدلنے کا حکم ہوا یہاں بھی کاغذات وغیرہ دکھانے پر وقت صرف کرنا پڑا - خدا خدا کر کے یہ مرحلہ طے ہوا اور دوسرے طیارے میں پہنچے جو ریاض پہنچ کر کچھ وقت ٹھہرا لیکن تبادلے کی زحمت نہیں ہوئی۔

جدّہ

ڈیڑھ بجے (سعودی ٹائم) جدّہ پہنچے - جو حضرات لینے کے لئے آئے ہوئے تھے - ان سے صورت آشنائی نہیں تھی - لیکن سید عبدالرشید صاحب فاضل کی کرامت کہیئے کہ انہوں نے اپنے فرزند سید ابرار حسین صاحب (لائبریرین ریاض) کو راقم کا ایسا حلیہ لکھ دیا تھا جو بہت کامیاب ثابت ہوا - انہوں نے اپنے عزیز اور عم زاد سید منور حسین (ساکن مکہ معظمہ) کو بہ تفصیل مطلع کر دیا تھا - وہ اپنے ایک دوست (نام یاد نہیں رہا) کو لئے ہوئے طیارہ گاہ جدّہ پر موجود تھے - جوں ہی میں نکلا - انہوں نے اپنی غیر معمولی فراست سے مجھے پہچان لیا - آگے بڑھے - تعارف و معانقہ ہوا —— ان کے ساتھ جدہ کے ساکن شیخ محمد علی صاحب کو حکیم غلام نبی امرتسری (مقیم لندن) نے میرا حلیہ بتا رکھا تھا - وہ مجھ سے پہلے عمرہ کر کے لندن روانہ ہو چکے تھے - شیخ صاحب بھی سید منور حسین صاحب کے عقب میں کھڑے مجھے متجسس نظروں سے دیکھ رہے تھے - آگے بڑھے، میرا نام پوچھا، وہ مجھے لینے میں اور میں انہیں پانے میں کامیاب ہوا —— اب دو گاڑیاں شیخ صاحب کے دولت خانے کی طرف روانہ ہوئیں - وہاں پہنچ کر شکرانے کے نفل ادا کئے

تیری رحمت ہے اے مرے مالک!

میں کہاں اور یہ مقام کہاں ؟

ناؤ نوش کا دور چلا - راقم مسافر طیارے ہی میں اتنا پُر ہو چکا تھا کہ شریک طعام و چائے نہ ہو سکا سید منور حسین صاحب ساڑھے پانچ بجے شام آنے کا وعدہ کر کے اپنے کسی کام پر چلے گئے اور راقم بستر راحت پر دراز ہو گیا۔

مکّہ معظمہ

سید منور حسین مغرب کے بعد آئے اور مجھے تیار ہونے کو کہا، یہیں احرام باندھا اور ہم سب موٹر میں بیٹھ گئے طیارہ گاہ سے شہر جدہ قریباً ۴۰ منٹ کا موٹر کا سفر ہے اور جدہ سے مکہ قریباً ۴۰ منٹ موٹر رواں دواں ہے دائیں بائیں روشنیاں، عمارات اور ساتھ ہی ساتھ میدانی علاقے بھی دکھائی دے رہے ہیں - موٹروں کی بے پناہ کثرت ہے اور اس کے سوا کوئی دوسری سواری رکشا، تانگہ، بگھی وغیرہ نظر نہیں آئی - جدہ اتنا پھیلا ہوا ہے کہ موٹر کی تیز رفتاری کے باوجود اس کی عمارتیں ختم ہونے میں نہیں آتیں - آخر بہت دور جا کر معلوم ہوا کہ اب ہم مکّے کی سڑک پر پہنچ گئے ہیں - چلتے چلتے ایک جگہ موٹر رکی - یہ ایک روشن علاقہ تھا - دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مکّے کی سرکاری عمارت ہے - اب ہم شہر مقدس کی طرف جا رہے تھے - شہر میں داخل ہونے کے بعد ایک جگہ پھر موٹر رکی - ایک صاحب سے میرا تعارف کرایا گیا کہ یہ اکرم صاحب ہیں سید ابرار حسین صاحب کے استاد اور آپ (قریشی) کا قیام انہی کے ہاں ہو گا کئی سڑکیں عبور کرنے کے بعد ایک چھوٹے سے مکان میں ہم داخل ہوئے - یہاں سے طہارت و وضو کر کے ہماری موٹر نے حرم کا رخ کیا - رات کا کچھ حصہ گزر چکا ہے - حرم میں ہر طرف ہجوم خلائق ہے - بیت العتیق کے طواف میں شب و روز کے ایک لمحے کے لئے بھی توقف نہیں ہوتا (الّا اوقات صلوٰۃ) راقم نے سب سے پہلے طواف عمرہ کی سعادت حاصل کی -

آخری طواف میں کعبے کے زرفاعی سے بنے ہوئے دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے لئے - خاص عزیزوں ، دوستوں اور محسنوں ملک وملت اور مسلمانانِ عالم کے لئے دعائیں کیں اور کعبہ کے قریب ہی نفل شکرانہ ادا کئے - اس کے بعد صفا مروہ کے سات چکر ٹھیلے پر بیٹھ کر پورے کئے - تعجب ہوا کہ صفا مروہ کا صرف نام ہی رہ گیا ہے پہاڑیاں ختم کر دی گئی ہیں - حالانکہ قرآن حکیم میں ان کو "شعائر اللہ" میں سے کہا گیا ہے -

بیت الاکرم

دن بھر کچھ کھایا پیا نہیں تھا - مجھے سخت بھوک لگ رہی تھی - اکرم صاحب کے گھر کا رخ کیا - وہاں پہنچ کر احرام کھولا اور بے تکلف ہو کر کھانے کا مطالبہ کیا - بیت الاکرم پہلی ہی ملاقات میں مجھے کچھ کچھ اپنا گھر معلوم ہونے لگا - اور محترم میزبان گویا پہلے سے جان پہچان والے ہیں - دونوں میں تکلف کے حجابات کا شائبہ تک نہ تھا - دوسرے - تیسرے دن افراد خانہ (اکرم صاحب کے بیٹے اور محترم والد بزرگوار) سے اور زیادہ اپنائیت ہو گئی - آپ مکہ لائبریری میں ممتاز عہدے پر فائز ہیں - یہ بات میرے لئے اور زیادہ مسرت و اطمینان کا باعث ہوئی - جسمانی ضروریات اور سہولتوں کے ساتھ روحانی و ذہنی نعمتوں کا بھی اضافہ ہو گیا -

طعام شب

کھانا آیا تو وہ بالکل ذوق کے مطابق تھا - مچھلی ، سبزی قیمہ ، بازار سے خریدی ہوئی اعلیٰ درجہ کی گیہوں کی روٹی کھانے کے بعد میں نے اپنی عادت کے مطابق گڑ - شکر وغیرہ کسی شیرینی کا مطالبہ کیا تو مدینے کی کھجوریں آگئیں - خلافِ توقع کھجوریں بہت سخت اور میں ۹۰ سال کا پرانا (بیر کہن سال) دانتوں سے معذور اوپر کے سب دانت رحلت فرما گئے - نچلی صف والے کچھ رخصت ہوئے اور کچھ ہیں - ان سے برا بھلا کام لے رہا ہوں - مصنوعی دانت بنوانے کے لئے بہت زحمت اٹھائی - لیکن کامیابی نہ ہوئی خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کو مصنوعی دانت راس آگئے - اب ارادہ یہ ہے کہ باقی زندگی جو (کچھ زیادہ نہیں) دانتوں کے بغیر گزار لوں گا اور دندان ساز ڈاکٹروں کی ناز برداری نہیں کروں گا ——— خیر بڑی مشکل سے دو چار کھجوریں کھائیں - اکرم صاحب نے میری مجبوری محسوس کی اور اگلے دن کھجوریں دودھ میں بھگوا کر لے آئے - جزاھم اللہ -

اغذیہ اور اوقات

یہاں کھانے کے اوقات یہ ہیں - صبح سات بجے ناشتہ جو اچھا بھرپور ہوتا ہے ڈبل روٹی - مکھن - مونگ پھلی کا مکھن - شہد - پنیر - جام وغیرہ اور بہترین چائے پھر تین بجے پورا کھانا - اس میں بھی دو قسم کے سالن - عمدہ روٹی - کبھی پلاؤ قسم کے چاول - دہی شیجم وغیرہ کی کابی (جیسے ہمارے ہاں کانی گاجر کا اچار ہوتا ہے) اور کوئی میٹھی چیز - فرنی - سعودی حلوہ وغیرہ ——— اس کے بعد رات کے دس بجے ایسا ہی اہتمام ہوتا ہے - کبھی دوپہر کے کھانے کے ساتھ میٹھے پھل بھی ہوتے ہیں -

مکتبہ مرکزیہ مکہ پہلے دو دن تو میرا پروگرام یہ رہا کہ صبح ساڑھے سات بجے اکرم صاحب کے ساتھ لائبریری چلا جاتا۔ وہاں مطالعے کے لئے کچھ کتابیں نکلوائیں۔ سید قطب شہید کی تفسیر کی آٹھ جلدیں اپنے ایک کمرے کی میز پر رکھوائیں تفسیر کا مقدمہ جستہ جستہ دیکھ کر حیرت ہوئی اور دکھ بھی ہوا۔ سید قطب شہید کی فصیح و بلیغ عربی، خلوص اور عمیق قرآنی ذوق سے بہت متاثر ہوا اور دکھ اس بات کا کہ ایسی عظیم شخصیت کو جمال ناصر نے سولی پر لٹکوا دیا۔ میں نے مکہ لائبریری کے ایک فاضل رکن سے پوچھا۔ "سید کا قصور کیا تھا؟"

انہوں نے قرآن کریم کی وہ آیت پڑھی جس کا ترجمہ یہ ہے۔ (جن لوگوں نے اللہ کو اپنا رب کہا پھر اس پر استقامت دکھائی) یہی دینی استقامت ان کی جان لیوا ثابت ہوئی۔

مکھن کھن دا ما کریاں چھاچھ پی لئی ملوانیاں
دھکے مل دے انہاں نوں جنہاں رب پچھانیاں

یعنی مکار لوگ تو مکھن کھاتے ہیں (عیش کرتے ہیں) اور ملاؤں کو بھی چھاچھ مل جاتی ہے۔ اور اللہ کے عارفوں کو گھر سے بے گھر اور وطن سے جلا وطن کر دیا جاتا ہے۔

حرم میں دو ابتدائی دنوں کے بعد میرا پروگرام یہ ٹھہرا کہ ظہر، مغرب اور عشاء حرم میں اور روزانہ طواف بھی مغرب و عشاء کے درمیان۔ بیت الاکرم اور حرم کے درمیان کوئی بیس منٹ کا سفر ہے۔ سڑکوں کا نشیب و فراز بھی عبور کرنا ہوتا ہے۔ اس سے اچھی خاصی ورزش سی ہو جاتی ہے۔ میں راستوں سے واقف نہیں ہوں اور فطری طور پر کبھی بن نہیں سکتا کیوں کہ راہ شناسی میں سخت کند ذہن ہوں۔ اس لئے میرے خضر طریق اکرم صاحب کے والد محترم غلام مصطفیٰ صاحب روز اول ہی سے رفیق ہیں۔ ان کا وجود میرے لئے بہت بابرکت ثابت ہوا۔ آنے جانے میں ساتھ۔ نماز و جماعت میں ساتھ۔ طواف و نوافل میں ساتھ ——— ایسی مستقل رفاقت کم یاب ہے۔

سنت سماگم، ہرکتھا، تلسی دُرلبھ دو
ست، دارا تے لکشمی پاپی گھر بھی ہو

نیک صحبت اور ذکر خدا، اے تلسی! یہ دو چیزیں کم یاب ہیں۔ اولاد، قصر و ایوان، دولت تو فاجروں اور فاسقوں کے پاس بھی ہوتی ہے۔

اندرون مکہ مکہ شہر، روشنیوں کا شہر ہے، بڑے بڑے بلند بالا مکانات کا شہر ہے۔ اعلیٰ درجے کی صاف ستھری بہت ہی عریض سڑکوں کا شہر ہے۔ عظیم کاروبار تجارت کا شہر ہے، طہارت و تقویٰ اور تسبیح و تقدیس کا شہر رفعت و عظمت کا شہر ہے۔ بے پناہ و بے حساب زائروں اور سیاحوں کا شہر ہے۔ ملٹری پولیس کے جوانوں کا شہر ہے۔ ...

کہ شہر پہاڑوں میں ہے اور پہاڑ شہر میں ہیں ۔ عالی شان عمارتوں کا حسن و زیبائی اور شکوہ و رعنائی اپنی جگہ بجا و برحق ۔ لیکن پہاڑوں کی قدرتی شان، پتھروں کی رنگا رنگی، ان کے اوپر اور ان کے دامنوں میں عمارات کی "بخیہ گری" دیکھ کر قرآن کا وہ مقام یاد آجاتا ہے۔ جس میں کہ پہاڑوں کی موجودہ سائنس کے مطابق تصویر کشی کی گئی ہے معروف فرنگی روشن فکر علماء نے اس سے عجیب و غریب نکتے نکالے ہیں ۔ ان آیات کا ترجمہ یہ ہے (عثمانی) ــــــــــــ اور پہاڑوں میں گھاٹیاں ہیں، سفید اور سرخ۔ ان کے رنگ کی طرح طرح کے اور بہت گہرے سیاہ سفید بھی کئی درجے کے، کوئی بہت زیادہ سفید، کوئی کم، کوئی اس سے بھی کم تر اور سرخ بھی کئی درجے اور کالے ایسے کہ کوّے کے پر کی طرح (فاطر ع ۴)

زائرین زائروں کی شکل و صورت میں کرزن فیشن کا غلبہ ہے ۔ کہیں کہیں داڑھی والے بھی نظر آجاتے ہیں ۔ گورے چٹے حسین و جمیل، تیکھے اور دلکش نقوش والے چہروں کی ہر طرف بہار ہے سو

مرحبا اے حسین انسانو ! راستے جگمگائے جاتے ہیں

کہیں کہیں کالا حسن (یعنی بلالی حسن) بھی دکھائی دے جاتا ہے ۔ ہر ملک کا حسن و جمال، ہر ملک کے نقش و نگار، ہر ملک کی بولی اور کسوت و لباس یہاں جلوہ گستر ہے ۔

اعجازی دعا حرم محترم کی عظیم و وسیع عمارات اور فلک بوس میناروں کو دیکھتا ہوں اور اس زمانے کے بے آب و گیاہ دیہات نما مکّے کا تصور کرتا ہوں جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بعض اولاد کو یہاں بسایا تھا ۔ اور ان کی اعجازی دعا کی ہزاروں برس پر پھیلی ہوئی تاثیر کا مجسم و متشکل نظارہ کرتا ہوں ۔ کیا دنیا بھر میں ایسی مقدس و معلیٰ، مصفّٰی و مزکّٰی، آسودگی بخش اور امن و امان کا گہوارہ کوئی اور جگہ ہو سکتی ہے؟ غالباً نہیں ۔ یقیناً نہیں ــــ حرم کے ارد گرد پھیلے ہوئے بازاروں میں دنیا کی کون سی نعمت اور کون سی انسانی ضرورت کی چیز ہے جو نہیں مل سکتی سو

کس چیز کی کمی ہے مولا تری گلی میں

دنیا تری گلی میں ، عقبیٰ تری گلی میں

روزمرّہ کی کھانے پینے کی چیزیں دور دراز ممالک سے کھنچی چلی آرہی ہیں اور ترو تازہ ۔ "حرمت والی پناہ گاہ میں ہر شئے کے میوے اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں ۔ یہ روزی ہے ہماری (خدا کی) طرف سے ۔ (القرآن)

سیال دودھ، پوڈر دودھ، دہی، پنیر، پکی پکائی مچھلی، ٹماٹر کی چٹنی اور کیا کیا نعمتیں ہیں جو مشرق و مغرب کے ممالک سے چلی آرہی ہیں ۔ سبزیوں اور پھلوں سے لدی ہوئی دکانیں بھی دعائے ابراہیم کی معجزانہ تفسیر دکھا رہی ہیں

اے میرے رب اس شہر کو امن کی جگہ بنا اور اس کے باشندوں کو پھلوں کی روزی عنایت فرما۔ (البقرہ ع ۱۵)

ایک سرراہے خوشی

آج (۲ ...) حرم شریف میں ظہر کی جماعت میں میرے دائیں طرف ایک صاحب چھاتی کے اوپر ہاتھ باندھے اور رفع یدین کے التزام سے نماز گزار تھے۔ اور بائیں جانب والے مسلمان ہاتھ چھوڑے ہوئے اپنے مسلک کی نمائندگی کر رہے تھے۔ درمیان میں بندہ سطور ذلیس اپنے حنفی طریقے پر ناف ہاتھ باندھے ہوئے تھا —— ہم سب ایک ہی حرم کے نجدی، وہابی، حنبلی امام کے پیچھے فریضہ ادا کر رہے تھے۔ کسی کو کسی پر کوئی اعتراض نہیں آمین بلند آواز سے اور رفع یدین کرنے اور نہ کرنے والے ساتھ ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔ وہ وقت بھی ہمیں یاد ہے۔ جب آمین بالجہر اور رفع یدین پر خون ریزیاں اور مقدمہ بازیاں ہوتی تھیں۔ اور اب یہ رواداری جو صرف حرم میں ہے کاش تمام مسلم ممالک کو نصیب ہو اور مسلمان اپنے اپنے مسلک پر قائم رہتے ہوئے۔ دوسرے مسلک کے مسلمانوں کو اپنا بھائی سمجھیں اور مل جل کر اسلامی اتحاد کا مظاہرہ کریں۔

لمحۂ فکریہ

یہاں دور دراز ممالک سے مختلف مسالک و مشارب کے مسلمان مصارف کثیر اور مصائب سفر برداشت کر کے حاضر ہوتے ہیں طواف وسعی، دعا و صلوٰۃ اور ذکر و مناجات کا شرف حاصل کرتے ہیں۔ ان کے خلوص میں شبہ کوئی شقی القلب ہی کر سکتا ہے — ہر سال حج اور عمرے کے مواقع پر کروڑوں مسلمانوں کی دعائیں بارگاہ مجیب المضطرین میں پہنچتی ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کو قبولیت کا شرف بھی حاصل ہوتا ہوگا۔ لیکن یہ شرف غالباً نجی اور انفرادی حدود کے اندر ہی رہتا ہوگا۔ اجتماعی اور عالمی طور پر ہماری حالت میں کوئی بہتری نمودار نہیں ہوتی۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ ہم اخلاقی اور سیاسی اعتبار سے کچھ زیادہ ہی کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ جہاں جہاں مسلمانوں پر مظالم ڈھائے جا رہے ہیں (مثلاً بھارت، فلپائن، کشمیر، افغانستان، لبنان، اسرائیل وغیرہ) ہم ان کا کوئی سدباب نہیں کر پائے مٹھی بھر اسرائیلی ایک طرف اور دنیا بھر کے ایک ارب کے قریب مسلمان دوسری طرف —— اُس کی جارحیت اور ہماری بے بسی — اس سے زیادہ عبرت اور کیا ہو سکتی ہے؟ اس بارے میں ہماری دعائیں کیوں قبول نہیں ہوتیں؟ رب کعبہ ہماری دکھ بھری فریادیں کیوں نہیں سنتا؟ — چلو —— ہم عمومی حیثیت سے گناہ گار سہی — لیکن ہمارے بزرگوں نے امت کے حق میں جو دعائیں کیں ان کا اثر کہاں گیا؟ حضرت مجددؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ہمارے زمانے میں مولانا حالیؒ کی مناجات (اے خاصۂ خاصانِ رسل وقت دعا ہے) اور اقبال کی پراثر دعائیں بھی ہمارے زخموں کا مرہم نہ بن سکیں بلکہ آزادی حاصل کرنے کے بعد ہم اور زیادہ — بقول داغؔ

کی ترک مے تو مائلِ پندار ہو گیا ؂ میں توبہ کر کے اور گناہ گار ہو گیا

Star

اسٹار کی چمک دمک
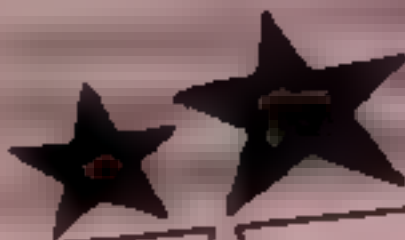
معیار کی ضمانت

بہترین اور معیاری فیبرکس کے لئے اسٹار کا نام یاد رکھئے۔ اسٹار فیبرکس جرمنی کے اعلیٰ ٹومیرا فائبر سے تیار کئے جاتے ہیں جو کہ سینفورائزڈ بھی ہیں یہی وجہ ہے کہ یہ کپڑے پہننے میں آرام دہ اور دیکھنے میں جاذبِ نظر محسوس ہوتے ہیں۔ آپ کو شرٹ یا شلوار قمیض کے لئے انتخاب کرنا ہو آپ باوقار رنگوں والے نرم و ملائم اسٹار کے شنگریلا، روبن، ٹونیا، سائینا سینیٹر اور راہنما کا انتخاب کیجئے۔

ہر دوسرے میٹر پہ لکھا ہوا اسٹار
دیتا ہے ضمانت کہ یہاں ہے معیار

Star اسٹار ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ
پوسٹ بکس نمبر
کراچی

STM 3/02

گرتے ہی —— جا رہے ہیں - ہمارے اکابر کے لئے یہ لمحۂ فکریہ ہونا چاہیئے سو

عمر بھر ہم مرثیہ لکھتے رہے قوم کے اخلاق اور اطوار کے قوم گرتی ہی گئی اور ہم بھی ساتھ بیٹھے ہی بیٹھے رخصت ہوئے

(انار قم عفی عنہ)

صرف مسلم

میں نے یہاں ایک کتاب میں پڑھا ہے کہ ایک خاص فرقے کے بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم اپنے امام کی تقلید نہیں کرتے، اتباع کرتے ہیں - اس سے میرے دل میں یہ تجسس پیدا ہوا کہ تقلید و اتباع میں کیا فرق ہے؟ لائبریری مکہ (مکتبۂ مرکزیہ) کے فاضل جلیل جناب (اس وقت تک نام معلوم نہ تھا) سے استفسار کیا تو انہوں نے کہا - اتباع صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض ہے - آپؐ کے سوا کسی کا اتباع امت پر فرض نہیں ہے۔

اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو تاکہ اللہ تم سے محبت کرے۔ (آل عمران ۴۴)

میں نے مکرر پوچھا کہ تقلید و اتباع میں لغوی فرق کیا ہے؟ جب کہ قرآن حکیم میں اتباع و اطاعت کے دو لفظ تو وارد ہوئے ہیں اور تقلید کا کہیں ذکر نہیں - بلکہ خود قرآن مجید کو بھی اندھے بہرے ہوکر پڑھنے سے روکا گیا ہے۔

جب ان کو ان کے رب کی آیات یاد دلائی جائیں تو ان سے اندھوں اور بہروں کا معاملہ نہیں کرتے (بلکہ تفکر و تدبر اور دھیان سے سن اور سن کر متاثر ہوں مشرکین کی طرح پتھر کی مورتیں نہ بن جائیں - (فرقان ۷۳) (ترجمہ از عثمانی)

اور جابجا تدبر، تفکر اور تعقل کی تاکید فرمائی ہے - یہاں تک کہ دوزخیوں کی زبان سے کہلوایا ہے - اگر ہم سنتے یا عقل سے کام لیتے تو دوزخی نہ بنتے - (ملک ع ۱) ترجمہ از عثمانی

یعنی سماعت آیات کے بعد عقل ہی ہے جس کا صحیح استعمال دوزخ سے بچا سکتا ہے۔

مولانا نے فرمایا —— "یہ لفظی ہیر پھیر ہے —— یعنی لفظ تقلید چھوڑ کر لفظ اتباع" اپنالیا - بات ایک ہی ہے - اس کے بعد انہوں نے نہایت پتے کی بات کہی کہ —— میرے والد ایک خاص فرقے سے وابستہ تھے - میرا اُن سے یہ اختلاف تھا کہ ہم کو صرف مسلمان کہلانا چاہیئے فرقہ بندی سے پرہیز کرنا چاہیئے" —— مولانا کی زبان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ پندرہ برس کی عمر میں ایک مشہور اہلحدیث عالم سے اس بات پر بحث کرتے تھے کہ آپ اہل حدیث کیوں کہلاتے ہیں جب کہ قرآن حکیم ہمکو صرف "مسلم" کہلانے کی تاکید فرماتا ہے - اس پر وہ عالم صاحب کوئی جواب نہ دے سکے! جواب کیا دیتے کیا قرآن کی تردید کرتے؟ "معاذ اللہ" - لیکن عملاً سب فرقہ پرست، قرآن حکیم کے خلاف کر رہے ہیں۔

دو نئے پھل

گزشتہ رات دسترخوان پر دو نئی چیزیں آئیں - ایک سالن اور ایک پھل - سالن کا نام "فول" بتایا گیا - جو سعودیوں کی مرغوب و مقوی غذا ہے - کھانے میں اس کا ذائقہ اور ہیئت لوبیے کے

قریب معلوم ہو رہی تھی۔ مگر اکرم صاحب نہ بتاتے تو میں اُسے قیمہ ہی سمجھ لیتا! دوسری چیز ایک پھل کے گچھے تھے۔ بالکل گول گول شکل کے بڑے بیروں کے قد کاٹھ کے مطابق دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ لبنانی انگور ہیں۔ انگور میں رس اور اوپر باریک چھلکا ہوتا ہے اس کے اندر رس اور اوپر چھلکا ندارد۔ ذائقہ میٹھا۔ کسی قدر کشمیری ناشپاتی یا بگو گوشہ کے مشابہ ۔ اندر انگور کے سے دو تین بیج۔

یہاں چائے میں جو چینی ڈالی جاتی ہے۔ اتنی موٹی دانے دار ہوتی ہے کہ مشکل سے حل ہوتی ہے۔ دیر تک چمچہ ہلاتا رہتا ہوں پھر بھی جب پی چکتا ہوں تو چینی کا کچھ حصہ پیالی کی تہ میں موجود ہوتا ہے۔ میں نے اکرم صاحب سے پوچھا یہ چینی کہاں سے آتی ہے؟ انہوں نے کہا ۔ " غالباً نیوزی لینڈ سے " اسی طرح یہاں کی ہر چیز ہزاروں میل کے سفر طے کر کے پہنچ جاتی ہے (یجبیٰ الیہ ثمرات کل شیءٍ) آیۂ کریمہ بار بار یاد آتی ہے۔ قرآن حکیم کے معجز ہونے کے بے شمار دلائل اور ثبوت ہیں۔ ان میں سے ایک واضح و محسوس ثبوت یہ بھی ہے کہ جو دعا چار ہزار سال قبل کی گئی ۔ اور جو آیات چودہ سو برس قبل نازل ہوئیں ان کی مجسم تفسیر ہم یہاں کے گلی کوچوں در بازاروں اسڑکوں میں دیکھ رہے ہیں۔

حرم کی بے مثلیت

میں نے اکرم صاحب سے پوچھا ۔ — میں تو صرف برصغیر پاک و بھارت کے چند شہروں سے واقف ہوں ۔ آپ نے دنیا دیکھی ہے ۔ کیا حرم کی عظیم و وسیع و نفیس عمارات کا جواب روئے زمین پر کہیں موجود ہے"؟ ———— انہوں نے کہا — نہیں — ایسی کوئی عمارت کہیں نہیں ۔ اور ایسا کوئی معبد بھی دنیا بھر میں نہیں پایا جاتا ۔ جہاں شب و روز کا ہر ہر لمحہ مشی و سعی و طواف، نماز و تلاوت تسبیح و تہلیل اور دعا و التجا سے معمور ہو یہ شرف اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے اسی گھر کو بخشا ہے۔

تعمیر حرم

سفرنامہ ارض القرآن (محمد عاصم) کی اشاعت اول اگست ۱۹۶۲ء میں منظر عام پر آئی۔ اس وقت میرے سامنے جون ۱۹۶۷ء کا نسخہ ہے۔ اس کے صفحہ ۱۶۸ کی یہ سطور محل و توقع کی مناسبت سے درج ذیل کی جاتی ہیں:

"... جس وسیع پیمانے پر یہ تعمیر (حرم) ہو رہی ہے۔ اُسے دیکھ کر لوگوں کا اندازہ ہے کہ اس کی تکمیل میں کم از کم بارہ تیرہ سال اور لگیں گے لیکن مکمل ہو جانے کے بعد حرم کی وسعت پہلے کی وسعت سے ڈھائی گنا ہو جائے گی ۔ اور اس میں بیک وقت پانچ لاکھ آدمی نماز پڑھ سکیں گے اور اس کا شمار دنیا کی چند بڑی عمارتوں میں ہوگا ۔ اندازہ یہ ہے کہ پوری عمارت پر دو ارب روپیہ کے قریب سرمایہ صرف ہو جائے گا ۔ یہ ساری تعمیر شاہ سعود اپنے ذاتی مصارف پر کرا رہے ہیں ۔ شاہ سعود کے کارناموں میں اس کا شمار یقیناً سرفہرست ہے ۔"

اس اقتباس کی اشاعت کے بیس سال بعد یہ راقم حرم میں حاضر ہو رہا ہے۔ اس درمیانی مدت میں جو تبدیلیاں ہوئیں۔ ان کا ذکر اکرم صاحب کی مدد سے اسی مقالے میں کسی دوسری جگہ کیا جائے گا ان شاء اللہ تعالیٰ

مذکورہ سفرنامہ میں یہ سطور بھی دکھائی دیں۔

"السیل الکبیر (براہ طائف) میں ایک شاندار نئی مسجد بنی ہوئی ہے۔ ہم (مولف و رفقاء) نے مغرب کی نماز اسی مسجد میں پڑھی۔ ایک نجدی امام صاحب نے جماعت کرائی اور اتنی تیز نماز پڑھائی کہ ہمارے لئے ان کی متابعت کرنا مشکل ہو رہی تھی" (ص ۱۷۲)

یہی منظر راقم الحروف نے حرم میں دیکھا بعض لوگ ایسی تیزی سے قیام و رکوع اور سجود کر چکے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے اور خیال آتا ہے کہ یہ لوگ کیا پڑھتے اور کیا سمجھتے ہوں گے۔ حالاں کہ یہ عرب ہیں اور عربی ان کی مادری زبان ہے — لیکن خدا کا شکر ہے کہ امام حرم کے پیچھے جتنی نمازیں پڑھیں ان میں توسط اور اعتدال ہی پایا اس پر ایک پرانی بات یاد آگئی کہیں پڑھا تھا۔

نماز اور خشوع

مولانا انور شاہ کشمیری مرحوم شیخ دار العلوم دیوبند نے لکھا ہے کہ میں نے فقہ کی کتابوں میں صلوٰۃ کی تفصیلات، شرائط وغیرہ کا بغور مطالعہ کیا۔ لیکن ان میں "خشوع" کا ذکر کہیں نہیں دیکھا آخر تلاش بسیار کے بعد ایک چھوٹا رسالہ ملا۔ جس میں ضمنی طور پر خشوع کا بھی کچھ ذکر موجود پایا۔

رویائے شاہ عبدالعزیز محدث

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا ایک خواب — پرانے زمانے میں کہیں نظر سے گزری تھی۔

"ایک مجلس آراستہ ہو رہی ہے۔ فرش بچھائے اور تکیے لگائے جا رہے ہیں۔ مقدس قسم کے کئی بزرگ اصحاب یہ اہتمام کر رہے ہیں۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بزرگ ترین شخصیت کا ورود ہوتا ہے۔ سب مؤدب ہو جاتے ہیں۔ نووارد بزرگ ایک تکیے سے لگ کر بیٹھ جاتے ہیں۔

میں (عبدالعزیزؒ) نے ایک صاحب سے پوچھا — "یہ کون بزرگ ہیں"؟ — جواب ملا۔

"امیر المؤمنین حضرت علیؓ ہیں"۔ میں بہت خوش اور حیران بھی ہوا — انہوں نے نظر بیں الٰہ‌دیں اور اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا۔ میں حاضر خدمت ہو گیا۔ آپ نے فرمایا:۔

"سنا ہے سندھی زبان میں ہمارے خلاف کوئی کتاب شائع ہوئی ہے۔ کیا تم نے دیکھی ہے؟"

میں نے عرض کیا۔ "حضرت میں سندھی نہیں جانتا۔ دریافت کروں گا۔" اس کے بعد میں نے عرض کیا۔

"اسلام جو آپ کے زمانے میں تھا۔ کیا ایسا ہی تھا، جیسا ہمارے ہاں رائج ہے"؟

فرمایا ——— "وہ اسلام اب کہیں نہیں ہے" ——— عرض کیا۔ "اور نماز جو ہم پڑھتے ہیں"؟ ———
فرمایا ——— "یہ وہ نماز نہیں جو ہم پڑھتے تھے"۔ پھر عرض کیا کوئی چیز اُس زمانے کی؟ فرمایا۔
"ہاں ذکر اللہ جو کہیں کہیں صوفیا میں پایا جاتا ہے۔ وہ ہمارے زمانے سے مطابقت رکھتا ہے"۔
میں نے عرض کیا۔ "مجھے اصلی نماز سکھا دیں"۔ "حضرتؒ نے مجھے نماز کی تلقین کی۔ تو معلوم ہوا کہ
میری سابقہ نمازیں۔ نمازیں ہی نہیں تھیں۔ اُس دن سے میری نماز صحیح ہوئی الحمدللہ"۔
(افسوس ہے کہ شاہ صاحب نے اپنے بیان میں اُس نماز کی تشریح نہیں بتائی)

پہلے عرض کر چکا ہوں کہ میں سفرنامہ لکھنے کے فن سے ناواقف ہوں۔ اپنے خیال میں جو بات محل و موقع کے مناسب سمجھتا ہوں۔ بے تکلفانہ لکھتا جاتا ہوں۔

مولوی عبداللہ غزنویؒ

ہمارے شہر (مرحوم امرتسر بھارت) میں مولوی عبداللہ غزنویؒ (مولانا محمد داؤد غزنوی مرحوم کے جدِ امجد) تعلّم حدیث کے لیے شمس العلماء مولانا نذیر حسین دہلویؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے ——— دورانِ تعلیم استاد و شاگرد میں قلبی ربط پیدا ہو گیا۔ سنا ہے کہ مولانا کبھی کبھی فرماتے میرے عزیز شاگرد عبداللہ نے حدیث مجھ سے پڑھی اور نماز میں نے عبداللہ سے سیکھی۔ اور کبھی مولوی عبداللہ کو مخاطب کر کے کہتے ؎

اے دہر آ مری جاں ہنر آزمائیں ÷ تو تیر آزما، ہم جگر آزمائیں

امرتسر کے بڑے بوڑھوں سے سنا ہے کہ مولوی عبداللہؒ کی نماز میں سوز و گداز اور حضورِ قلب کی ایسی کیفیت ہوتی تھی کہ مقتدی اُس سے بنہایت متاثر ہوتے تھے۔ ان کی رحلت کے بعد یہ نعمت ورثے کے طور پر ان کے فرزند جلیل امام عبدالجبار اور مولوی عبدالواحد مرحومین کو حاصل ہوئی۔ ذالکَ فضلُ اللّٰہِ یؤتیہِ من یشاء۔ پروفیسر ابوبکر ابن مولانا داؤد غزنوی سے راقم کو ملاقات کا موقع نہیں ملا۔ سنا ہے کہ وہ بھی صاحبِ دل نوجوان تھے۔ چند برس ہوئے لندن میں ایک موٹر کے حادثے میں فوت ہو گئے۔

ان تمام شواہد سے معلوم ہوا کہ نماز کی اصل روح خشوع اور حضورِ قلب ہے۔ اور یہی قرآن حکیم کا ارشاد ہے۔
نماز حضورِ قلب سے بہت بھاری ہے، مگر ان پر آسان ہے جو عاجزی کرتے ہیں۔ (البقرہ ع ۵) (عثمانی)

نماز نامقبول

ہمارے پنجابی شاعر سید فضل شاہ مرحوم (نواں کوٹ۔ لاہور) نے کہا ہے ؎

فضل باجھ نیاز نماز کیہی؟ ÷ سجدے کردیاں دے متھے گھس گئے

یعنی عجز و نیاز کے بغیر نماز کیسی؟ سجدے کرتے کرتے ماتھے گھس گئے (اور کچھ حاصل نہ ہوا)

شیخ سعدی نے بھی فرمایا ہے ؎

کلید درِ دوزخ است آں نماز
کہ در چشم مردم گزاری دراز

اقبال نے بھی ایسا ہی کہا ہے ؎

تیری نماز بے حضور، تیرا امام بے سرور
ایسی نماز سے گزر، ایسے امام سے گزر

حج کا ریہرسل اور حیاتِ اکرم

آج ۲۶ر فروری ۱۹۸۲ء ہے - ۱۲ بجے دوپہر کے قریب اکرم صاحب، ان کے فرزند صغیر فہیم سلّمٗ اور راقم لائبریری مکہ معظمہ (مکتبۂ مرکزیہ) سے نکلے - موٹر میں سوار ہوئے - اب مجھے مکمل حج کا ریہرسل کرایا جائے گا۔ ہمارا رخ میدانِ عرفات کی طرف ہے میری خواہش کے مطابق اکرم صاحب اپنے سوانح کا کچھ حصہ سناتے جا رہے ہیں۔ اور سفر بھی طے ہو رہا ہے — مظفر نگر (بھارت) اصلی وطن ہے - ابتدائی تعلیم بیکانیر راجستھان میں حاصل کی - ۱۴ برس کی عمر میں ملک تقسیم ہوا تو والدہ محترمہ اور بہن بھائیوں سمیت پاکستان آگئے - والد محترم ملازمت کی مجبوری کی وجہ سے وہیں رہ گئے - کراچی میں ماموں صاحب کے یہاں قیام کیا - ان کی معاشی حالت ایسی نہیں تھی کہ اس مہاجر خاندان کی کفالت کرسکتے - والدہ محترمہ اور بڑی بہن نے سینے پرونے کی محنت شروع کردی اور خود اکرم صاحب نے تعلیم کے ساتھ ساتھ جو بھی محنت مزدوری مل سکی اسکو ذریعہ معاش بنالیا - والدہ محترمہ کی ہدایت تھی کہ "بیٹا حالات کیسے بھی ہوں تعلیم میں کوتاہی نہ کرنا"۔ (سیلف میڈ) خود اعتمادی اور خود سازی کی برکت سے ایکنامکس (اقتصادیات) میں اوّل نمبر پر ایم - اے کیا۔ ملازمت میں ہاتھوں ہاتھ لیے گئے - محنتی بہت ہیں - وقت مقررہ سے زیادہ وقت کام کرتے - جہاں بھی رہے - قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے - کراچی یونیورسٹی میں لائبریری سائنس کے ..... (اور مکہ المکرمۃ آنے سے قبل صدر شعبہ تھے) پروفیسر رہے،

بیرونِ ممالک

امریکہ جانے کا موقع ملا، وہاں دو سال ملازمت اور حصول تعلیم میں گزارے - امریکہ قیام کے دوران ایک معزز خاتون مسز لینزلی کے مہمان رہے جو سماجی کاموں میں بہت حصہ لیتی تھیں انہوں نے ان کو وہاں کی معتدد شخصیات سے روشناس کرایا - ریڈیو ٹیلی ویژن پر ان کی تقاریر کرائیں - شہریوں کے میئر نے ان کو شہر کی چابی عطا کی اور اعزازی شہری حقوق عطا کیے - پھر پاکستان آگئے - کچھ عرصہ بعد سعودی عربیہ میں بلائے گئے - یہ ۱۹۷۶ء کا دور تھا - جب سے اب تک مکہ معظمہ میں مقیم ہیں - خدا کے فضل سے تین بیٹوں کے باپ ہیں - تینوں مختلف مدارج میں زیر تعلیم ہیں - تربیت ایسی اعلیٰ ہے کہ کردار و اخلاق میں شائستہ و ممتاز ہیں محترم باپ سے ذہانت و فطانت ورثے میں حاصل کی ہے -

والد محترم جناب قدم معصوم صاحب کا وقت زیادہ عبادت، تلاوت، اور حرم محترم میں گزرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس خاندان کو خوشحالی اور سعادت دینوی و اُخروی سے بہرہ مند رکھے، اور ہر مسلم خاندان کو ایسی ہی برکات سے نوازے، اکرم صاحب اقتصادیات وغیرہ علوم سے متعلق متعدد انگریزی اردو کتابوں کے مصنف و مترجم ہیں۔

عرفات

ہم عرفات کی طرف جا رہے ہیں۔ میدان عرفات کا آغاز ہو گیا۔ وسیع مسجد نمرہ کی زیارت ہوئی۔ یہ ابھی زیر تعمیر ہے۔ جیسے جیسے گاڑی آگے بڑھ رہی ہے۔ میدان عرفات کی وسعت پھیلتی چلی جا رہی ہے۔ حج کے دنوں میں یہاں خیموں کا شہرستان آباد ہو جاتا ہے۔ اس میدان کی لمبائی چوڑائی کا اندازہ معلوم نہ ہو سکا۔ پہاڑوں کا سلسلہ ساتھ ساتھ چلتا ہے دائیں بائیں قدرت کے یہی شاہکار دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں حجاج کا قیام صبح سے مغرب تک ہوتا ہے۔ یہیں جبل رحمت کی زیارت ہوئی۔ جہاں حسب روایت حضرت آدم و حوا (علیہما السلام) نے توبہ درود کی تھی عرفات میں ان کی آپس میں ملاقات بتائی جاتی ہے۔ جبل رحمت دوسرے پہاڑوں سے مختلف ہے۔ یہاں بڑے بڑے پتھر تہ بہ تہ چنے ہوئے ہیں۔ چوٹی پر ایک سفید مینار چھوٹا سا نصب ہے۔ جو ابوالبشر کے کھڑے ہونے کا مقام خاص سمجھا جاتا ہے۔ اس جگہ تین نوجوان عرب موجود تھے ڈنڈے ہاتھ میں لیے پھر رہے تھے۔ زائرین یہاں اپنے فوٹو کھنچواتے ہیں۔ اکرم صاحب نے بھی میرا اپنا اور بچے فہیم کا فوٹو کھنچوایا اور کچھ ریال دے کر انہیں خوش کر دیا۔ وہاں سے ہم چلے تو مزدلفہ پہنچے۔ یہاں بھی حاجی ایک رات آسمان کے نیچے قیام کرتے ہیں۔ اس سے آگے طلوع آفتاب کے بعد منیٰ کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ مزدلفہ سے منیٰ جاتے ہوئے وادی محسر پڑتی ہے یہاں پر اللہ کے حکم سے ابابیلوں نے ابرہہ کے لشکر کو تباہ کیا تھا۔ یہیں پیدل والوں کو حکم ہے کہ وہ اس وادی سے تیز تیز قدموں سے چلیں اور استغفار پڑھتے رہیں۔ منیٰ میں تین رات ٹھہرتے ہیں۔ اسی دوران حرم آ کر طواف زیارہ کرتے ہیں۔ یہیں تین نشانوں (جمرۃ الاولیٰ، جمرۃ وسطیٰ، جمرۃ کبریٰ) کو کنکریاں مارتے ہیں۔ یہی مقام ہے جہاں قربانی کی جاتی ہے۔ جانوروں کو کاٹ کاٹ کر بھٹی میں پھینک دیا جاتا ہے۔ تیسرے دن غروب آفتاب سے پہلے پہلے حاجی مکہ کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔

قربانی

قربانی کے جانوروں کو تلف کرنے (یا ان کی سڑاند وغیرہ مضرتوں سے بچنے کے لیے) تین بڑی بڑی بھٹیاں (یا آتش کدے) تعمیر کیے گئے ہیں۔ کتنے دکھ کی بات ہے کہ اس طرح بے اندازہ دولت کو راکھ بنا دیا جاتا ہے کیا یہ عمل دین فطرت سے مطابقت رکھتا ہے؟ اللہ تعالیٰ حکیم ہے، قرآن بھی حکیم ہے اور جس کو حکمت دی گئی اس کو بقول قرآن خیر کثیر دی گئی۔ کیا اس ضیاع عظیم میں کوئی حکمت ثابت کی جا سکتی ہے؟ کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اسوہ یا سنت یہی ہے؟ کیا ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کرام رضی نے اس طرح.... قربانیاں دی تھیں؟ ان سوالات کا جواب یقیناً نفی میں ملے گا۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ حکومت کو متعدد مرتبہ اس طرف توجہ دلائی گئی کہ آج کل سائنس کا زمانہ ہے۔ ذبیحوں کے تمام اجزا (کھال، ہڈیاں، خون گوشت وغیرہ) کو محفوظ کر کے ان سے بڑے کام لئے جا سکتے ہیں اور کروڑوں اربوں روپیہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔

مولانا غلام مرشد مرحوم صدر ایوب کے زمانے میں شاہی مسجد لاہور کے اُس وقت کے خطیب مولانا غلام مرشد مرحوم نے اپنے عید الاضحیٰ کے خطبے میں اس امر پر مدلل روشنی ڈالی تھی جو عوام کو پسند نہ آئی، اس کے نتیجے میں مولانا مرحوم کو مسجد کے عہدۂ امامت سے دست بردار ہونا پڑا۔ سچائی کو ہر عہد میں مصلوب کیا گیا، لیکن سچائی پھر بھی زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔

فضائل اکرم میرے محترم میزبان جناب غنی الاکرم صاحب نے اپنی بعض اردو تصانیف مجھے مرحمت فرمائیں میں نے ان کے سرسری مطالعے سے سمجھا کہ میں ایک عظیم علمی اخلاقی شخصیت کی میزبانی کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔ الاکرم نے بعض پیراز عوارض کے باوجود مجھے تنہا مبلے رفیق اس بڑے سفر کی توفیق عطا فرمائی اور عمرے کا شرف بخشا۔ اس کا شکریہ ادا کرنا میری استطاعت سے باہر ہے۔ اس کے ساتھ دوسرا شکریہ یہ بھی ہے کہ مجھے ایک تاریخی انسان سے متعارف اور مستفیض ہونے کا موقع دیا۔ جو اپنے مخصوص فن (لائبریری سائنس) میں استادی کے مرتبے پر فائز ہیں۔ اور اس فن پر ایسی کتابیں لکھی ہیں جو اس کے طلبہ کی رہنمائی کرتی رہیں گی۔ ان کے تلامذہ کی کثیر تعداد پاکستان اور ممالک عربیہ میں یہ اہم علمی خدمات سرانجام دے رہی ہے۔ یہ نوجوان تلامذہ آپ کے علم و فضل سے مستفیض ہونے کے ساتھ آپ کے محاسن اخلاق سے بھی عشق کی حد تک مسحور و متاثر نظر آتے ہیں۔ یہ بات مجھے "بزم اکرم" کراچی کے مجلہ "اکرم" کی نظم و نثر کے مطالعے سے معلوم ہوئی۔ میں اس رسالے کے سرسری مطالعے سے حیران رہ گیا۔ کہ ایک سادہ، منکسر اور بے تکلف وجود میں کتنی خوبیاں پنہاں ہیں اور ان کا اظہار و اعتراف کس کس پیرائے میں کیا گیا ہے۔ موصوف آجکل ایک امریکی یونیورسٹی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے رجسٹرڈ ہیں۔ امید ہے انشاءاللہ اس سال کے آخر تک یہ اپنا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ پیش کر دیں گے۔

چند روزہ قیام کے دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ بابرکت گھر علماء و زائرین اور ضرورت مندوں کا ملجا و مرجع ہے۔ اکرم صاحب کی وسعت اخلاق کا یہ عالم ہے کہ امکانی حد تک سب کے کام کرتے اور مشکلات کو حل کرتے ہیں کبھی کسی کا خیر مقدم کرتے جا رہے ہیں اور کبھی کسی رخصت ہونے والے کی مشایعت ہو رہی ہے۔ یہ سب کچھ اپنی بے پناہ گھریلو اور ملکی مصروفیت کے باوجود ان کی وسعت اخلاق کا ایک شعبہ ہے۔

مکۃ المکرمہ کے قیام کے دوران اکرم صاحب کے ساتھ جامعۃ ام القریٰ کے کتب خانہ کو بھی دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ کتب خانہ عربی کتب کا ایک عظیم ذخیرہ ہے۔ تمام علوم دینیہ اور دیگر علوم پر کئی لاکھ کتب جمع کی گئی ہیں بہت سے مخطوطات موجود ہیں۔ عربی کے علاوہ انگریزی، فرانسیسی، جرمن۔ اطالوی۔ اردو۔ فارسی۔ عبرسا، ملیشی زبانوں پر بھی بے شمار کتب موجود ہیں کتب خانہ کئی دن جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں چند مقتدر اور ذی علم شخصیات سے تعارف ہوا جن میں محترم عادل عثمانی صاحب۔ عبدالرحمن صاحب۔ تمر مرزا صاحب۔ چودہری محمد یعقوب صاحب سے شرف ملاقات حاصل ہوا ان حضرات سے بڑی اچھی علمی گفتگو رہی۔ اکرم صاحب کی قیام گاہ پر ایک رات ڈاکٹر محمد مظہر بقا صاحب سے نیاز حاصل ہوا۔ یہ ـــــ صاحب جامعہ کراچی میں شعبہ معارف اسلامیہ میں استاد اور صدر شعبہ رہے ہیں۔ جامعۃ ام القریٰ مکۃ المکرمہ میں استادِ مشارک (ایسوسی ایٹ پروفیسر) اور مرکز بحث العلمی میں تحقیق کا کام سرانجام دے رہے ہیں۔ اردو میں ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں مکۃ المکرمہ سے بھی عربی میں ان کی تصانیف جامعہ کی طرف سے شائع ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سے بڑی بصیرت افروز اور علمی گفتگو رہی۔ مکۃ المکرمہ میں جن حضرات اور صاحبانِ علم سے ملاقات ہوئی اس سے بے حد مسرت حاصل ہوئی۔ لیکن اس بات کا قدرے دکھ بھی ہوا کہ ہماری حکومت اور قوم نے ان کی قدر نہ جانی اور ایسے ایسے نہ معلوم کتنے مدبر، مفکر اور علمائے کرام ناسازگار حالات کے پیش نظر ملک بدر ہونے پر مجبور ہوئے اور دوسرے ممالک میں اپنے علمی اور تحقیقی جواہر پارے پیش کر رہے ہیں۔ کاش ہمارے ملک کے اہل اقتدار ان ہستیوں کی قدر کرتے اور ان کو وہ سہولتیں مہیا کرتے جن کے وہ مستحق تھے تو ہمارا ملک ان کے علمی و فکری کام سے فیضیاب ہوتا۔

مناجات

آج ۲/۸/۵، مدینہ منورہ کی تیاری ہے، رات کو آخری بس پر جانا ہو گا۔ علامہ اقبال نے اپنے تصوراتی و خیالی سفر حجاز میں مکہ معظمہ سے رخصت ہوتے، مدینہ کو جاتے ہوئے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا تھا

تو باش ایں جا و با پاکاں بیامیز — کہ من دارم ہوائے منزل دوست

میں، "ایں جا" "آنجا" اور راہ سفر میں ـــــ ہر ہر مقام پر یکہ و تنہا گھر سے نکلا ہوا ضعیف و نحیف اور سقیم و علیل مسافر۔ اے اللہ تیرے مضبوط سہارے سے محروم نہیں رہا۔ "بالعروۃ الوثقیٰ لا انفصام لہا"[1] آج شب کے سفر اور اس کے بعد کے ایام میں بھی تیرے ہی اٹوٹ آسرے کا طلب گار ہوں۔ تیری رفاقت و حفاظت

---

[1] ایسا مضبوط اور قابل اعتماد حلقہ جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا (بقرہ ۲۵۶)

تیرے قرب و معیت کا احساس میرا سرمایۂ حیات ہے۔ ـــــ میرا رب یقیناً میرے ساتھ ہے وہی میری راہ نمائی کرتا رہے گا۔ (شعراء ع ۴) اے میرے رب! جہاں مجھے پہنچانا ہے (مدینہ میں) خوش اسلوبی سے پہنچا اور جہاں سے نکالنا ہو (مکہ سے) وہ بھی خوش اسلوبی سے ہو۔ (بنی اسرائیل ع ۹)

میرا عجز و احتیاج (بلحاظ اسباب) اور میری بے کسی اور بے بسی تیرے سامنے ہے۔ تو ہی غریب نواز ہے۔ تو ہی بے سہاروں کا سہارا اور بے آسروں کا آسرا ہے سہ

اُو چارہ کار بندہ داند ـــ چوں ہیچ وسیلتش نماند

دیدم گل تازہ چند دستہ ـــ بر گنبدے از گیاہ بستہ
گفتم چہ بود گیاہ ناچیز؟ ـــ تا در صف گل نشیند او نیز
بگریست گیاہ و گفت خاموش ـــ صحبت نکند کرم فراموش
ہر چند کہ نیست رنگ و بویم ـــ آخر نہ گیاہ باغ اویم؟

اے بار خدائے عالم آرائے
بر سعدیؔ/عرشیؔ پیر خود بہ بخشائے

سعدیؔ/عرشیؔ رہ کعبۂ رضا گیر ـــ اے مرد خدا رہ خدا گیر!
زین در بہر کس کہ سر بتابد
ترسم کہ در دگر نیابد

اَلَیسَ اللہُ بِکَافٍ عَبدَہٗ (زمر ع ۴) کیا اللہ اپنے بندے کے لئے کافی نہیں ہے؟ تو نے اے میرے رب! میرے عاصی و خاطی ہونے کے باوجود مجھے اس آیت مبارکہ میں "اپنا بندہ" فرمایا۔ اپنی مستحکم اپنائیت کی ابدی سعادت سے نوازا ہے سہ

کعبہ را یک بار بیتی گفت یار
گفت "یا عبدی" مرا ہفتاد بار (رومیؒ)

اے اللہ! تو میرا اپنا ہے۔ میں تیرا اپنا ہوں۔ تو سب کا ہے، سب تیرے ہیں۔ میری باقی زندگی کا ایک لمحہ بھی تیری اپنائیت سے محروم نہ رہے۔ میں سفر و حضر ـــ خواب و بیداری، کسی حالت میں بھی تیری اپنائیت کے شرک م

مبارک احساس سے محروم نہ رہوں - یہی اپنائیت اور تقرب و محبت میری ابدی پناہ رہے - زندگی میں - موت کے وقت اور اس دن جب کوئی کسی کے کام نہیں آئے ——————— سلامتی ہو مجھ پر اُس دن جب میں مروں اور جب میں دوبارہ زندہ کیا جاؤں - (سورۃ مریم) ترجمہ عثمانی

اے اللہ! مجھے روزِ قیامت رسوا نہ کیجیو، - مجھے اُس دن رسوا نہ کیجیو جب سب راز کھل جائیں گے —— اس دن مجھے رسوا نہ کیجیو جب لوگ دوبارہ اٹھائے جائیں گے اس دن جب مال و اولاد میں سے کوئی کام نہیں آئے گا - (شعراء ع ۵) (ترجمہ عثمانی)

اے اللہ! دیارِ حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف اس عاجز و ناتواں کا سفر بخیر و خوبی ہو - وہاں چند روزہ قیام بخیر و سلامت ہو - وہاں سے جدہ واپسی بخیر و سلامت ہو جدہ سے کراچی کی طرف پرواز بخیر و سلامت ہو - یا مَنْ بیدکَ الخیر، انت علیٰ کل شئی قدیر انت اقرب إلیّ من حبل الورید - انت معی اینما کنت - انت مقصودی و رضاکَ مطلوبی - انت حاضری انت ناظری، انت ذاکری، انت حافظی - انت رازقی انت غافری - انت ناصری، انت معی - الیکَ المرجع والیکَ المصیر - اے وہ جس کے قبضۂ قدرت میں خیر ہے - تو میری رگِ جاں سے بھی (زیادہ) قریب ہے - تو قادرِ مطلق ہے - میں جہاں بھی ہوں تو میرے ساتھ ہے - تو میرا مقصود ہے، اور تیری خوشنودی مجھے مطلوب ہے - تو میرے سامنے موجود ہے، تو مجھے دیکھ رہا ہے تو مجھے یاد فرماتا ہے - تو میرا نگہبان ہے، تو میرا رازق ہے - تو مجھے معاف کرنے والا ہے - تو میرا مددگار ہے - تو میرے ساتھ ہے - تیری ہی طرف رجوع کرنا اور لوٹ کر جانا ہے -

رخصت اے بلدِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) رخصت اے میرے رب کے گھر!

رخصت اے اوّل بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکاً وھدی للعالمین (آل عمران ع ۱۰) سب سے پہلا گھر جو سب انسانوں کے فائدے کے لئے بنایا گیا تھا، وہ ہے جو مکّہ میں ہے، وہ تمام جہانوں کے لئے برکت والا مقام اور موجبِ ہدایت ہے -

رخصت اے بیتِ عتیق (حج ۴۴) رخصت اے حرمِ پاک (حرماً آمناً) امن کی جگہ (قصص ۶۴)

رخصت اے البلد الامین! تیرے بے مثال شرف و تقدس سے لبریز جذبات کو سینے میں لئے ہوئے رخصت ہوتا ہوں - میرے عمر بھر کے سجدے تیرے ذریعے سے، تیری جہت سے ہو کر میرے رب کی بارگاہ تک پہنچے اور پہنچتے رہیں گے - میری کیا ہستی ہے اولیاء اللہ، ائمہ ہدیٰ اور شہنشاہانِ عالم کی عجز و نیاز بھری پیشانیاں بھی

تیری طرف جھکی رہیں اور جھکی رہیں گی — اے دعائے خلیلؑ کے مظہرِ اعلیٰ! رخصت! اسلام ہو تجھ پر، تیرے مکینوں پر اور تیرے زائروں پر — ابد تک سلام۔ لاہور، راولپنڈی، کراچی، جدہ اور مکہ معظمہ کے تمام دوستوں، عزیزوں اور کرم فرماؤں پر سلام — لندن کے باسی حکیم غلام نبی اور بنکاک تھائی لینڈ کے مکیں محترم عبدالمجید جامی اور ان کے خاندان والوں پر سلام جن کی تحریک و تشویق اور تعاون سے مجھے یہ سعادت نصیب ہوئی کہ اس بیت ربی میں تیرے جوار میں بیٹھا یہ سطور لکھ رہا ہوں اور تیرے منقش و مذہب دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر — اور نوافل ادا کرتے ہوئے بھی عزیزوں، دوستوں، ملک و ملت اور مسلمانانِ عالم کے حق میں دعا کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ الحمدللہ۔
ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم ۔

یہ ارضِ پاک کہاں اور کہاں یہ عبدِ حقیر
زہے یہ بخت، خوشا یہ نصیب، یہ تقدیر!

دیارِ حبیبؐ کو روانگی

۵/۲/۸۲ کو محترم غنی الاکرم مجھے مدینے کی بس میں سوار کرانے کے لئے اپنی موٹر میں لئے جا رہے ہیں راستے میں ایک چھوٹے سے پختہ مکان کی طرف اشارہ کر کے انہوں نے کہا کہ یہ حضورؐ کی ولادت کا مقام ہے۔ ایک عرب نے حکومت سے خرید کر اس میں ایک کتب خانہ قائم کر دیا ہے جو کبھی کبھی کھلتا ہے اس کی پیشانی پر "مکتبہ..." لکھا ہوا ہے۔ کچھ فاصلہ اور طے کیا تو ایک مسجد دکھائی دی — موصوف نے بتایا کہ یہ مسجد جن ہے جہاں قوم جن کے کچھ افراد نے حضورؐ سے بیعت کی تھی۔

بس کے اڈے پر پہنچے تو میری جگہ خود اکرم صاحب قطار میں کھڑے ہو گئے۔ ٹکٹ فروش لڑکا اپنے کاموں میں ادھر ادھر بھاگ رہا ہے تاخیر پر تاخیر ہو رہی۔ ٹکٹ کی التجا کی جاتی ہے تو "صبر صبر" کہہ کر پھلانگ جاتا ہے۔ آخر قریباً ایک گھنٹے کے بعد ارشاد ہوا کہ بس میں جگہ نہیں ہے۔ اکرم صاحب کا حوصلہ قابل ستائش ہے کہ واپس ہو کر کار میں بیٹھنے لگے تو کہا — "اس میں اللہ کی کوئی حکمت ہوگی" میں نے کہا "بجا" — ابھی ہم سامان کار کے عقب میں رکھ کر خود بیٹھنے کی تیاری کر رہے تھے کہ ایک بھاگتے ہوئے شخص نے کہا۔ "مدینے جانا ہے تو میرے پیچھے آؤ"۔ ہم اپنی گاڑی اس کے پیچھے لے جا کر وہاں پہنچے جہاں ایک بس کھڑی تھی۔ وہاں اکرم صاحب نے مجھے بٹھایا اور شخص مذکور کو میرے ساتھ اچھے سلوک کی تاکید کر کے رخصت ہوئے۔ جاتے جاتے میرے شدید انکار کے باوجود مجھے ایک اور احسان کے بوجھ تلے دبا کر گویا پیس ہی دیا۔ یعنی میرے لئے ٹکٹ خریدنے کی مجھے اجازت نہیں دی۔

اب ڈرائیور صاحب سواریوں کے پاسپورٹ لئے ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں۔ کسی محکمانہ کارروائی کی تکمیل کے لئے

اس کشمکش میں پھر قریباً ایک گھنٹہ صرف ہوا۔ خدا خدا کرکے گاڑی حرکت میں آئی۔ میل ہا میل تک عمارتیں، روشنیاں اور آبادی کے ساتھ چلتے گئے۔ یعنی مکہ معظمہ بھی بہت پھیلتا جا رہا ہے۔ راستے میں دو جگہ ڈرائیور صاحب چائے کے لئے اُترے۔ ہر مرتبہ چائے پر آدھا، پون گھنٹہ صرف ہوا۔ مسافر اونگھ رہے ہیں۔ انہیں پروا نہیں معلوم ہوا کہ چائے کے ساتھ گپ بھی چلتی ہے۔ اس لئے زیادہ وقت لگتا ہے۔

دیارِ حبیبؐ

خدا خدا کرکے رات کے پچھلے پہر چار بجے کے قریب دیارِ حبیبؐ میں داخل ہوئے۔

مرجع عاشقاں دیارِ حبیبؐ	نورِ دل، نورِ جاں دیارِ حبیبؐ
جذبِ مشتاق و دل ربائی میں	انتخابِ جہاں دیارِ حبیبؐ
کعبۂ عارفانِ حسنِ ازل	قبلۂ قدسیاں دیارِ حبیبؐ
اک سیہ کار اور یہ درگاہ!	میں کہاں اور کہاں دیارِ حبیبؐ

اس قسم کے اشعار ذہن میں ڈھلنے لگے۔ مجھے مدینے میں پاکستان کلینک کے ڈاکٹر محمود صاحب کے ہاں ٹھہرنا تھا۔ گاڑی کے دو ساتھیوں نے میرا بستر اور اٹیچی اٹھائی اور مجھے ہسپتال پہنچا دیا۔ خوش قسمتی سے دروازہ کھلا تھا۔ ورنہ کہیں سڑک پر ۳-۴ گھنٹے۔ طلوعِ آفتاب تک منتظر رہنا پڑتا۔ کرسیاں اور صوفہ سیٹ موجود تھے۔ یہ طویل وقت کبھی بیٹھ کر کبھی لیٹ کر اور اونگھ کر گزرا۔ اوپر سے یکے بعد دیگرے تین آدمی اُترے۔ ان سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب جدّہ گئے ہوئے ہیں۔ کل لوٹیں گے۔ ان سے سامان رکھنے اور ٹھہرنے کی التجا کی، مگر بے سود۔ اب کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ ہوٹل بھی اس وقت کہاں ہو اور ہو بھی تو اُس کے مصارف؟ ہوٹل کی بود و باش کا دل میں کروں خیال ؎ یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے سا سمجھا کہ بیت اکرم کی آسائشوں اور نعمتوں کے بعد یہ ذرا سا امتحان بھی حکمت سے خالی نہیں۔ دعائے یونس م اور دوسری دعائیں مانگتے ہوئے وقت گزر گیا۔ آٹھ بجے کے قریب۔ ایک پاکستانی دوا لینے کے لئے آیا اس کے بعد ایک اور آ گیا۔ میں نے ان سے اپنی حالت و حاجت بیان کی اور ایک مزید ایڈریس جو میرے پاس تھا۔ ان سے دریافت کیا۔ انہوں نے تسلی دی کہ ہم پہنچا دیں گے۔ ڈاکٹر محمود صاحب کو موجود نہ پاکر کسی اور ہسپتال کی طرف یہ کہہ کر چلے گئے کہ ہم دس پندرہ منٹ میں آ رہے ہیں۔ چنانچہ وہ آئے اور میرا سامان اٹھا کر چل پڑے ایں ان کے پیچھے پیچھے جن صاحب کے پاس جانا ہے۔ ان سے بھی کوئی سابق آشنائی نہیں ان کے نام کے دو رقعے میرے پاس موجود ہیں۔ کیا خبر پہچانیں گے یا نہیں؟

بقول مولوی غلام رسول "مصنف" احسن القصص " داستان یوسف زلیخا) سو

آن ڈٹھیاں دا شوق جنہاں نوں　　آن ملیاں دی یاری

او تھے دل دیاں دل نوں رمزاں　　وچ دیاں ہوسن کاری

(رمزاں: مزباں)　(وچ دیاں: لگ دیاں)

یوسفؑ کو (بقول روایت) ـــــــ دیکھے بغیر زلیخا عاشق ہو گئی تھی - اس کی طرف شعر میں اشارہ ہے کہ جن کو نہ دیکھے ہوؤں کا شوق اور نہ ملے ہوؤں کی یاری سے سابقہ پڑ جائے، وہاں تو دلوں پر ہی دلوں کی پوشیدہ (دار مزیں) اپنا وار کر رہی ہوں گی ـــــــ ناصر علی سرہندی نے خوب کہا ہے سو

محبت جادۂ دارد نہاں در خلوتِ دل ہا

چو تار سبحہ گم گردید ایں رہ زیر منزل ہا

محبت کی ایک پگڈنڈی ہے جو دلوں کے اندر ہی اندر پنہاں رہتی ہے - تسبیح کے دھاگے کی طرح یہ راستہ منزلوں کے نیچے ہی نیچے گم چلا گیا ہے۔

انعامؔ صاحب

خیر اسی گو مگو میں نادیدہ منزل یعنی شارع باب السلام کی ایک گھڑیوں کی دکان پر پہنچے - سامان رکھ دیا اور رقعہ دکان دار کے ہاتھ میں تھما دیا - وہ پڑھ رہے ہیں میں اس انتظار میں ان کا چہرہ دیکھ رہا ہوں کہ رقعہ کا اثر کیا ہوتا ہے ؟ شکر ہے کہ انہوں نے سامان رکھوا لیا اور جانے کے لئے کہ مجھے اطمینان ہو کہ اب میں بے ٹھکانہ نہیں ہوں - شکر ایزد -

یہ تھے انعامؔ[1] صاحب ڈیرہ غازی کے رہنے والے، مدینے میں گھڑیوں کی فروخت کا کاروبار کرتے ہیں - میں ان کے ذریعے اپنے ایک مرحوم دوست کے بیٹے غلام قادر سے ملنا چاہتا تھا - ان سے بھی میری کوئی راہ و رسم نہیں تھی - صرف بزرگوں کے واسطے سے رابطہ قائم کیا جا رہا تھا - انعامؔ صاحب نے مجھے سرکاری حمام (بیت الخلاء) کی طرف رہنمائی فرمائی - میرا پاکستانی ساتھی جس نے مجھے انعام صاحب تک پہنچایا تھا - میرے ساتھ گیا - اور مجھے مزید ممنون کر کے رخصت ہوا - میں اطمینان سے حوائج ضروریہ سے فارغ ہوا - ٹونٹیوں کے پاس بیٹھ کر آنکھوں پر پانی کے خوب چھینٹے مارے - سر کو ٹھنڈا کیا - رات بھر گاڑی میں جاگا تھا - اب ہوش و حواس درست ہوئے - اور انعام صاحب کی دکان پر آیا انہوں نے بہت عمدہ چائے اور بسکٹ سے تواضع کی اور کہا کہ اب آپ حرم میں چلے جائیں - میرے پاس کوئی دوسرا

---

[1] یاد نہیں رہا کہ انعام الحق نام ہے یا انعام اللہ -

شغل نہیں ہے۔ اس لئے ظہر کے بعد آجائیے گا۔ میں آپ کو غلام قادر کے گھر پہنچا دوں گا۔

حرم میں حاضری

میں حرم میں حاضر ہو گیا۔ جی بھر کے کونے کونے کی زیارت کی۔ روضۂ اقدس کی جالی میں جھانکنے کے لئے آگے بڑھا تو پاس ہی کھڑے ہوئے سعودی سپاہی نے اپنے ہاتھ سے پیچھے ہٹا دیا۔ اس کی ڈیوٹی یہی ہے کہ کسی کو آگے نہ بڑھنے دے۔ معلوم نہیں کہ قبر کو دیکھ لینے سے کون سا شرک لازم ہو جاتا ہے؟ حرم کی عظمت و شان اور عمارات کا حسن و زیبائی۔ قیمتی پتھر کے فرش سیمیں اور سنہری جالیاں سنہری ستون گویا جگہ جگہ چاندی سونا بکھرا ہوا ہے مجھے اُس کچی۔ کھجور کی چھت والی مسجد کا خیال آیا جس کے تربیت یافتہ مٹھی بھر (۳۱۳) انسانوں نے دنیا بھر کو ہلا دیا اقوام عالم کی تقدیریں بدل ڈالیں۔ ایسا مقدس انقلاب برپا کیا جو چشم عالم نے اس سے پہلے کبھی دیکھا۔ نہ اس کے بعد وہ سعادت کسی تحریک کو نصیب ہوئی۔ ان کی تاثیر آج بھی روئے زمین کے گوشے گوشے میں موجود ہے اور ہم ایک ارب کے لگ بھگ! یا الہیٰ ہمیں کیا ہو گیا۔ بار بار اقبالؔ یاد آتا ہے ؎

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

کیا ہم یہی رونا روتے رہتے، اپنا ماتم کرتے اور اپنا مرثیہ پڑھتے اور لکھتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔ ہماری دعاؤں اور فریادوں کی کبھی شنوائی نہیں ہو گی؟۔

غلام قادر پر لیس

ظہر حرم شریف میں ادا کی اور شارع باب السلام میں انعام صاحب کی دکان پر پہنچا انہوں نے دکان بند کی (معلوم ہوا کہ ظہر کے بعد دکانیں بند ہو جاتی ہیں، پھر عصر کے بعد کھلتی ہیں) اور مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر غلام قادر کے گھر لے آئے۔ غلام قادر موجود نہ تھے۔ ان کے ایک دوست نے مجھے ان کے کمرے میں بٹھایا اور کھانے کا انتظام کیا۔ کھانے کے بعد قیلولہ کرتے۔ شام کے بعد غلام قادر آئے میں نے ان کے عمہ زاد بھائی نثار علی ابن امیر علی تول (راولپنڈی) کا رقعہ پیش کیا۔ اس سے شناسائی کا آغاز ہوا۔ ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ سے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ عربی گزارے کے مطابق بولنے لگے ہیں۔ لباس سے عرب ہی معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں احباب و رفقاء کا جمگھٹا رہتا ہے۔ اس وقت میں یہ سطور انہی کے کمرے میں بیٹھ کر لکھ رہا ہوں۔ آج فروری ۱۹۸۲ء کی ۷ تاریخ ہے۔

پاکستانی ہسپتال

عصر کے بعد پاکستانی کلینک کی طرف روانہ ہوا، یہ جگہ (بیت القادر) مسجد ابی ذر رضی اللہ عنہ سے قریب ہے، یہاں سے کلینک کا فاصلہ ایک میل سے کم ہی ہو گا۔ کلینک سے حرم تک تیز چل کر منٹ

میں پہنچ جاتے ہیں۔ کلینک والی عمارت میں حج کا دفتر بھی ہے جو ایام حج میں کھلتا ہے۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ.... ڈاکٹر محمد حسین صاحب جدہ سے واپس آگئے ہیں۔ ان سے ملاقات ہوئی، عزیز گرامی جناب رشید نثار صاحب (جو راولپنڈی کی شعری و ادبی مجالس کے معزز رکن ہیں) کا مکتوب میرے متعلق ڈاکٹر صاحب کو مل چکا تھا۔ اسی کی وساطت سے تعارف کا مرحلہ طے ہوا۔ فوراً ہی چائے اور اس کے ساتھ بہت سا "وغیرہ" بھی آگیا۔ میں نے معذرت کی کہ میری نحیف و نازک صحت بے وقت کی کوئی چیز برداشت نہیں کرتی۔ تاہم چائے کے چند گھونٹ "تکلفاً" لے لئے۔ میرے لئے کسی تمہید و طلب کے بغیر ہی ایک کمرہ وقف کر دیا گیا، ایک رفیق کار کو حکم ملا کہ اس کی چابی مجھے دے دی جائے۔ میں نے کہا مجھے کمرہ دکھلا دیا جائے، رفیق کار (نثار خاں) مجھے ساتھ لے کر کمرے میں پہنچا جو کلینک سے دو تین منٹ کے فاصلے پر ایک بڑی بلڈنگ کے کونے میں واقع ہے۔ نثار خاں نے مجھے کمرے کی تمام کام کی چیزوں (غسل خانہ۔ برقی سوئچ خاص قسم کے تالے کو کھولنے، بند کرنے) سے متعارف کرایا۔ اور میرے ساتھ میرا سامان لینے کے لئے "مسجد ابی زرعہ" کی طرف چل پڑا۔ شارع ابی زرعہ ایک لمبی سڑک ہے۔ جس پر چلتے ہوئے دور سامنے کی طرف پہاڑ دکھائی دے رہا ہے۔ میں نے نثار سے پوچھا تو اس نے بتایا یہ "جبل اُحد" ہے۔ کوٹھے سے میرا سامان اتارا اور ٹیکسی میں رکھ کر کمرے میں پہنچے مغرب کی اذان کی آواز آ رہی تھی۔ نثار خاں نے کہا جلدی وضو کرو۔ دونوں نے وضو کیا اور حرم میں پہنچے، جو قریب ہی ہے۔ میرے ناشتے اور کھانے کا انتظام نثار خاں کے سپرد ہوا۔ عشاء کے بعد کلینک میں پہنچا تو مریض آجا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ پاکستانی اور عرب، سب ہی یہاں سے مستفید ہوتے ہیں۔ اور پاکستان کے مرکزی ہسپتالوں میں غریب مریضوں کی جو مٹی پلید ہوتی ہے، کھال اتاری جاتی ہے اور کج خلقی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اور غریبوں کے لئے جو دوائیں ہسپتالوں کو دی جاتی ہیں ان کا بیشتر حصہ ہسپتالوں کے کارکن ہڑپ کر جاتے ہیں اور مریضوں کو بازار سے خریدنے کی تلقین فرمائی جاتی ہے۔ یہاں ایسی بدعنوانی کا شائبہ تک نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے حسن سلوک سے مریض مطمئن ہو کر جاتے ہیں۔ کاش پاکستانی ہسپتالوں میں کام کرنے والے عملے کو ان کے فن کے ساتھ انسانیت کی تعلیم بھی دی جاتی۔ البتہ بعض ہسپتالوں میں بہت کم ایسے ڈاکٹر، ڈسپنسر وغیرہ بھی مل جاتے ہیں جن کے جسم میں انسانیت کی روح زندہ ہوتی ہے اور مریض ان کے علاج کے ساتھ ان کے حسن خلق سے بھی مستفید ہوتے ہیں۔ ایسے شریف النفس افراد کی تعداد اس بھیڑ میں اتنی ہے، جتنا آٹے میں نمک ــــ بہت سے دور دراز علاقوں سے آتے ہوئے مریض ہسپتالوں کے قرب و جوار میں معالجین کی بے التفاتی کی وجہ سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر یا تو مر جاتے ہیں یا اپنا مرض ساتھ لئے ہوئے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں بڑے لوگوں کی طرف سے

ہر محکمے (پولیس وغیرہ) کو صرف وعظ کر دیا جاتا ہے۔ یہ "وعظ" کا سلسلہ ۴۲ برس سے جاری ہے اور ہر برائی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ کاش نفاذ اسلام کی ساعت قریب آئے اور غریب عوام کو کچھ سکون چین نصیب ہو۔

میرا پروگرام

اب میرا پروگرام یہ ہے کہ نماز فجر کے بعد پونے سات بجے ہسپتال جاتا ہوں، نثار خاں ناشتہ میرے حسب منشا تیار کر دیتا۔ ناشتہ کرکے اپنے کمرے میں آکر قیلولہ کرتا ہوں، جو فراغت کی وجہ سے خاصا طویل ہوتا ہے۔ قبل دوپہر لکھنے پڑھنے میں وقت گزارتا ہوں یہاں سے حرم شریف قریب ہی ہے ظہر کی اذان کی آواز آتی ہے تو جاکر شریک جماعت ہو جاتا ہوں۔ نماز سے فارغ ہو کر کھانے کے لئے ہسپتال پہنچتا ہوں۔ نثار کھانا تیار کرکے لے آتا ہے۔ جو بالکل میرے ذوق کے مطابق، کم مرچ اور مزے دار ہوتا ہے۔ کھانے کے بعد پھر کمرے میں قیلولہ کرتا ہوں اور چار بجے کے قریب مسجد ابی ذر رض کی طرف غلام قادر کے کمرے کا رخ کرتا ہوں یہ ایک متقی سی سیر ہو جاتی ہے۔ کمرہ کبھی خالی ہوتا ہے اور کبھی کوئی شخص موجود مل جاتا ہے۔ سہ پہر کی چائے اور کچھ پھل کھا کر شام تک یہاں رہتا ہوں۔ پھر واپس اپنے کمرے میں آجاتا ہوں۔ مکہ معظمہ میں جناب غنی الاکرم (جو اپنی ذات میں اک انجمن تھے) کی وجہ سے سوسائٹی اور لائبریری میسر تھی۔ میرا وقت گھر گھی میں گزرتا تھا یہاں یہ بات حاصل نہ ہوسکی۔ کسی علمی حلقے سے تعارف نہیں۔ کہیں آنا جانا اور نشست برخاست کا تعلق نہیں۔ زیادہ وقت تنہائی میں گزرتا ہے۔

۱۰ فروری کو ناشتے کے وقت میں ایک رقعہ لکھ کر ڈاکٹر صاحب کی میز پر رکھ آیا (ان کی مصروفیات کی وجہ سے ملاقات یا بات چیت کا کوئی موقع نہیں ملتا) اس میں میں نے ان سے انٹرویو لینے کی خواہش ظاہر کی اور اپنے بعض پیرانہ عوارض سے متعلق مشورہ طلب کیا۔

طبی معائنہ

رات کے کھانے کے وقت گیا تو انہوں نے مجھے اپنے کلینک میں بلایا اور لٹا کر طبی آلات کی مدد سے جسم کے بعض حصوں کا معائنہ کیا۔ لو بلڈ پریشر تشخیص ہوا۔ اسی وقت دائیں، بائیں بازوں پر دو انجکشن طاقت کے لگائے اور دو شربت دن میں تین مرتبہ پینے کی ہدایت کے ساتھ عنایت فرمائے۔ اور انٹرویو کے متعلق فرمایا کہ "جس دن آپ رخصت ہوں گے اس کے لئے وقت نکالا جائے گا۔"

مریضوں سے برتاؤ

تاہم رواداری میں کچھ سوال جواب ہو ہی گئے۔ جن سے معلوم ہوا کہ عرب غیرعرب مقامی غیر مقامی ہر قسم کے مریض آتے ہیں۔ جن کی بولیاں مختلف ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب تقریباً ۴ برس سے یہاں رہ رہے ہیں۔ متعدد مختلف بولیوں سے واقف ہو گئے ہیں عمرے پر آنے والوں کے لئے ہر دوا ہسپتال سے مہیا کی جاتی ہے مقامی لوگوں سے ان کی حسب استطاعت برتاؤ کیا جاتا ہے۔ غرباء کو مفت دوائیں ملتی ہیں۔ امراء کو قیمتی دوائیں بازار سے لانے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ متعدد مریضوں کو دیکھنے اُن کے گھر پر جاتے ہیں۔

صاحب استطاعت اصحاب سے فیس وصول کرتے ہیں۔ غریبوں پر کوئی بوجھ نہیں ڈالتے۔

جرائم کے متعلق دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ سخت شرعی قوانین کے باوجود جرائم کا قلع قمع نہیں ہو سکا۔ جن کا ارتکاب زیادہ تر غیر ملکی (پاکستانی وغیرہ) کرتے ہیں۔ رشوت بھی چلتی ہے۔ الغرض سے

بہر زمیں کہ رسیدیم آسمان پیدا ست

لیکن ہمارا ملک جس طرح جرائم کی منڈی بن چکا ہے۔ یہاں ایسی بات نہیں ہے۔ چور کبھی پکڑے جاتے ہیں تو شرعی سزا (قطع ید) ملتی ہے۔ بسا اوقات قابو میں نہیں آتے۔

آشوب چشم | یہ تحریر یہاں تک پہنچی تو میں آشوب چشم میں مبتلا ہو گیا۔ لکھنا پڑھنا بند۔۔۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے دوست پاکستانی آئی اسپیشلسٹ کے پاس بھیجا۔ انہوں نے کھانے اور لگانے کی متعدد دوائیں دیں اور بلڈ پریشر کو درست کرنے کا پیغام ڈاکٹر محمود حسین کے نام دیا۔ ڈاکٹر صاحب پہلے ہی بہت توجہ فرما رہے تھے۔ آشوب نے خلاف توقع طویل کھینچا۔ مدینہ منورہ سے جدہ تک اور پھر جدہ سے کراچی تک میرے مشاغل کا محاصرہ کئے رکھا۔ تقریباً تین ہفتے کے بعد آج یہ سطور لکھنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ دیکھنے والے کہتے ہیں کہ بہت خفیف سی سرخی ابھی باقی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور شفا بخشی سے امید ہے کہ جہاں اتنے بڑے "غشاوہ" سے نجات مل گئی ہے وہاں یہ ذرا سا اثر بھی جو رہ گیا ہے اس سے بھی شفا مل جائے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

ڈاکٹر محمود حسین | ذکر ہو رہا تھا ڈاکٹر محمود حسین صاحب کی طبی خدمات کا۔ انہوں نے میرے سوالات کے جواب میں بتایا کہ ایام حج میں تقریباً ۵۰ ہزار مریض۔ اور باقی پورے سال میں اتنے ہی ہسپتال سے مستفیض ہوتے ہیں۔

بلڈ پریشر، گردے کے امراض اور آنتوں کے امراض زیادہ ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ایم، بی، بی، ایس ہیں سرجری (جراحی) کے مریض نہیں دیکھے جاتے۔ سعودی حکومت نے منع کیا ہوا ہے۔

آنکھ، کان، ناک اور دانتوں کے معمولی عوارض کا علاج خود ہی کرتے ہیں۔ خاص حالات میں اسپیشلسٹ معالجین کی طرف مریضوں کو بھیج دیتے ہیں۔ میرے ایک سوال کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے یہ الفاظ مجھے اپنے قلم سے لکھ کر دیئے ۔۔۔ "معذور مریض میری دولت ہیں۔ ان کو دیکھنا میری عبادت ہے۔ فیس تو کیا، اپنے پاس سے ان کی خدمت کرتا ہوں۔" میں نے آؤٹ ڈور اور ان ڈور انتظام کے متعلق پوچھا تو بتایا۔

"یہاں صرف آؤٹ ڈور علاج کیا جاتا ہے۔ سستی اور مہنگی دوائیں پاکستانی حکومت مہیا کرتی ہے۔ اس کے

علاوہ اللہ تعالیٰ کے بہت سے مخیر بندے بھی اس میں حصہ لیتے ہیں۔

میں نے کہا ——— "میرا خیال ہے کہ پاکستانی ڈاکٹروں سے جسطرح عام مریض شاکی ہوتے ہیں یہاں یہ صورت نہیں ۔ مریض عموماً آپ کے برتاؤ سے مطمئن رہتے ہیں" ——— ڈاکٹر صاحب نے میری گذارش پر کہا۔

"یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر عنایت ہے کہ مجھ جیسے اور میرے اسٹاف کو اپنی امت کی خدمت کے لئے چنا ہے ہم پر لازم ہے کہ اس کی قدر کریں۔" (دراصل حضورؐ کا وجود مبارک انسانیت پر اور خصوصاً اُمت پر اللہ کی رحمت اور نظر عنایت ہے وہ جسے چاہے اپنے بندوں کی خدمت کے لئے چن لے۔ یہی حضورؐ کی تعلیم ہے۔ اللّٰه يصطفى...الخ هو اجتباكم.... الخ ۔ اللہ چن لیتا ہے۔ اللہ نے تم کو چن لیا (رج ۱۰۴)

یہاں کبھی کبھی یہ بات بھی سننے میں آئی کہ "مدنی ؐ رحم کرے گا"۔ جب کہ خود مدنی سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے مطابق ارحم الراحمین تین مرتبہ اور خیر الراحمین ایکبار قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کی صفات میں وارد ہوا ہے۔ کوئی بڑی سے بڑی ہستی بھی اس صفت میں شریک ذات نہیں اور "رحمن ورحیم" تو ہر سورت کے آغاز میں (سورہ توبہ کے سوا) ۱۱۴ مرتبہ دہرایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سورتوں کے متن میں یہ مدلول لفظ اُن سے قریب المعنی الفاظ رؤف، غفور، حلیم وغیرہ اتنی مرتبہ آئے ہیں کہ اُن کا شمار دشوار ہے۔ ایسی بدیہی اور یہ تکرار وصاحتوں کے باوجود ہمارے ہاں حفظ مراتب کا بہت کم خیال کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ نوّے سے زیادہ لفظ "رحمت" کسی نہ کسی جہت سے اللہ کی طرف مضاف ہوکر آیا ہے۔ مثلاً رحمۃ، رحمتنا، رحمتک وغیرہ۔ انبیاء کرام کا اسوۂ مبارکہ بھی یہی ہے کہ وہ اللہ سے "رحمت" طلب کرتے رہے ہیں۔ مثلاً رب اغفر وارحم وانت خیر الراحمین (مومنون ۴ ۶)

یادگاریں

تاریخی یادگار زیارتوں کے لئے عزیزم غلام قادر کے ساتھ بات ہوئی وہ ۲ ا فروری کو اپنی موٹر لے کر آ گئے ـــ انہوں نے سنایا کہ ایک دفعہ ایک پاکستانی معین خاندان کے لوگ آئے اور مجھے کہا کہ ہمیں کوئی ایسا مقام دکھایئے۔ جو عہد نبوی ؐ سے اب تک ویسے ہی محفوظ ہو۔ اس میں جدّت یا تبدیلی نہ آئی ہو میں نے اس کے متعلق تحقیق کی تو کوئی ایک جگہ بھی ایسی نہ ملی جو بالکل ویسی ہو، جیسی اس زمانے میں تھی ہر ہر مقام کو زمانے نے اپنی جدّتوں سے بدل کر رکھ دیا ہے۔ ہاں صرف ایک جگہ ایسی ہے۔ جو بدل نہیں سکی اور وہ ہے "جبل اُحد"۔ چنانچہ اس خاندان کو وہاں پہنچایا گیا۔ اور وہ لوگ دم لے لے کر کئی گھنٹوں میں اس چوٹی پر پہنچے۔ جہاں غزوۂ اُحد میں بعض غازیوں کو کھڑا رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔ لیکن وہ اس حکم نبوی ؐ کو ملحوظ نہ رکھ سکے اور فتح شکست میں بدل گئی ـــ اگرچہ بعد میں اللہ کی رحمت نے اس کی تلافی کردی۔ اور ان کو معاف کر دیا۔ اوپر چڑھنے والوں نے کھانا جو ساتھ لے گئے ۔ چڑھنے کے دوران ہی میں تناول کیا ـــــ مجھے بھی سب سے پہلے

اُسی چوٹی کی زیارت نصیب ہوئی - پہاڑ کے ایک کونے میں ایک سفید پتھر دکھایا گیا - اور بتایا گیا کہ اس جگہ حضور ؐ کا دندان مبارک شہید ہوا تھا۔ (واللہ اعلم بالصواب) جبل اُحد ہی کے دامن میں وہ قبرستان ہے جہاں شہدائے اُحد مدفون ہوئے - اب وہاں صرف ایک قبر سید الشہداء امیر حمزہ رضؓ اور دوسری ایک اور صحابی کی موجود ہے - باقی تمام قبریں زمین سے ہموار کردی گئی ہیں —— یہاں ہر وقت زائروں کا ہجوم رہتا ہے اور شہدائے کے نام لے لے کر ان پر سلام بھیجا جاتا ہے۔ یہاں سے ہم چلے تو یکے بعد دیگرے کئی مساجد کی زیارت ہوئی - یہ سب موجودہ زمانے کی پختہ تعمیریں ہیں - ان کے نام یہ بتائے گئے —— یہ مسجد قبا ہے —— یہ مسجد ذو قبلتین ہے یہ مسجد وہ ہے جہاں پہلی نماز جمعہ ادا کی گئی —— اس سے آگے مساجد سبعہ (سات مسجدیں) ہیں جو آپس میں ایک دوسرے سے قریب ترین ہی ہیں ان کے نام خلفاء راشدین رضؓ اور حضرت فاطمہؓ کے ناموں پر رکھے گئے ہیں —— غلام قادر ہر مقام کے متعلق کچھ تاریخی باتیں بتلاتے رہے - کئی باتیں کتابوں کے ذریعے پہلے سے معلوم تھیں - ہر مسجد میں زائروں کے ہجوم نوافل ادا کرتے رہتے ہیں۔

مسجد حضرت ابوذر غفاریؓ تو غلام قادر کے کمرے سے بالکل قریب تھی - یہاں مغرب کی متعدد نمازیں ادا کیں۔

ایک حادثہ

ڈاکٹر صاحب نے ۸ دن کے لئے کمرہ مستعار لیا تھا - ۱۲ فروری آخری دن تھا میں ۱۲ فروری ہی کو غلام قادر کے کمرے میں منتقل ہوگیا - یعنی صرف سات دن ڈاکٹر صاحب کے ہاں مقیم رہا۔

۱۳ فروری کی سہ پہر کو ایک الم ناک حادثہ پیش آیا - حادثے ہمیشہ ہی الم ناک بلکہ ہولناک ہوتے ہیں مگر پردیس میں یہ حادثہ - اُف ! توبہ !! استغفراللہ !!! - واقعہ یہ ہوا کہ میں نے ایک لڑکے کو مشین میں کپڑے دھوتے ہوئے دیکھا تو کہا کہ میری قمیص اور پاجامہ بھی صاف کردو یہ کہہ کر دونوں کپڑے اس کے سپرد کردیئے —— چند گھنٹوں کے بعد یاد آیا کہ پاسپورٹ قمیص کی جیب میں تھا - بس ! کچھ نہ پوچھیئے - میرا کیا حال ہوا - خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا (نساء ۲۸) اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ ھَلُوْعًا اِذَا مَسَّہُ الشَّرُّ جَزُوْعًا (معارج ۱۴) —— (انسان ضعیف بنایا گیا ہے۔ انسان جی کا کچا پیدا ہوا ہے۔ جب اسکو تکلیف پہنچے تو صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے) —— مجھ پر یہ آیات پوری طرح طاری ہوگئیں - اب اُس لڑکے کو ڈھونڈتا پھر رہا ہوں - وہ کہیں دکھائی نہیں دیتا - پھر کپڑوں کو تلاش کر رہا ہوں کہ اُس نے دھو کر خشک ہونے کے لئے کہاں رکھے ہیں —— اسی دوسرے بلاک میں ایک کمرے میں کپڑے زمین پر پھیلائے ہوئے نظر آگئے - اوپر سے پنکھا چھوڑ رکھا تھا کہ اس کی ہوا سے خشک ہوجائیں - قمیص اٹھائی - جیب کو ٹٹولا تو اسمیں پاسپورٹ مل گیا جو ابلتے ہوئے پانی اور شست و شو کی حرکات سے بدحال ہوچکا تھا - دوسرے کمرے میں بیٹھے ہوئے ایک نوجوان کو دکھایا کہ "اب اس کا کیا بنے گا" اس نے ورق ورق

کھول کر دیکھا۔ اور مجھے تسلّی دی کہ فکر نہ کرو۔ اس کا کچھ نہیں بگڑا۔ اوراق اور ان پر لکھے ہوئے حروف سب سلامت ہیں۔ حیرت ہوئی کہ اتنے کٹھن مرحلوں سے گزرنے کے بعد کیسے سلامت رہے گی۔ اس کے اور بھی بعض رفیقوں نے اس کو خوب دیکھ بھال کر تصدیق کی کہ بالکل صحیح سلامت ہے۔ اس کو آہستہ آہستہ خشک کیا اور اللہ تعالیٰ کا شکر بجالایا کہ اس نے بہت بڑی آفت سے معجزانہ طور پر بچالیا۔ الحمدللہ۔

جدّہ

۱۳ر فروری کو شیخ محمد علی صاحب (جدّہ) سے ٹیلی فون پر بات ہوئی۔ مدینہ منورہ پہنچتے ہی انہیں عریضہ لکھ چکا تھا۔ اب انہیں کہا کہ ۲۰ر فروری کے لگ بھگ طیارے میں سیٹ کا انتظام کر دیجیے۔ انہوں نے فرمایا کہ ۱۴ر فروری کو اس کے متعلق اطلاع دیں گے ـــــ شیخ صاحب حکیم غلام نبی صاحب کے عزیز ہیں ان کی تاکید کے مطابق مجھے اپنے بہترین تعاون سے نوازتے رہے۔ ۱۴ر کو انہوں نے بتایا کہ سیٹ کا انتظام فی الحال نہیں ہو سکا۔ ڈاکٹر محمود حسین صاحب کو اس تاخیر کا علم ہوا تو انہوں نے کہا کہ ان کو پہلے کیوں نہیں بتایا گیا۔ وہ اپنے اثر و رسوخ سے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اسی وقت پی۔ آئی۔ اے کو فون پر بلایا اور میرا نام وغیرہ بتا کر تاکید کی کہ سیٹ کے معاملے میں ہرگز تاخیر نہ کریں ـــــ اس کا اثر یہ ہوا کہ ۱۵ر کو شیخ محمد علی صاحب نے خوش خبری سنائی کہ ۱۹؍۲؍۸۲ کو سیٹ کا انتظام ہو گیا ہے۔ الحمدللہ۔ رات دس بجے جدہ سے روانگی ہوگی اور صبح ۴ بجے (پاکستانی وقت کے مطابق ۶ بجے) کراچی پہنچنا ہوگا۔ انشاء اللہ۔

آشوب چشم کا علاج جاری ہے۔ لکھنا پڑھنا بند ہے ـ ۱۵ر کو ڈاکٹر صاحب سے رخصت ہوا۔ وقت رخصت انہوں نے دواؤں اور دعاؤں سے محظوظ کیا اور معانقہ کر کے خدا حافظ کہا۔

۱۶؍۲؍۸۲ آخر شب ۴ بجے غلام قادر صاحب کی موٹر میں سوار ہو کر جدّہ کی طرف روانگی ہوئی۔ صبح ۸ بجے سے قبل جدہ پہنچ گئے۔ فون پر شیخ محمد علی صاحب کو اطلاع دینی چاہی تاکہ وہ مجھے سابق تجویز کے مطابق خود آکر اپنے دولت کدے پر لے جائیں۔ کیونکہ میں جدّے کی طویل سڑکوں اور راستوں کو پہچان نہیں سکتا تھا۔ بار بار فون کرنے پر ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ان کے بتائے ہوئے مفصل پتے پر ان کا دولت کدہ ڈھونڈتے گھنٹے تک تلاش کرتے رہے، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ یہ ایک نئی غیر متوقع مصیبت پیش آگئی۔ آخر بڑی دشواری اور تاخیر کے بعد وہ فون پر مل گئے! انہوں اپنی کوئی قانونی مجبوری بتائی کہ وہ خود ایک مخصوص قطے سے ادھر اُدھر نہیں جا سکتے۔ جب تک ان کو سرکاری اجازت نامہ (جو تجدید کے لئے متعلقہ دفتر میں بھیج رکھا ہے) حاصل نہ ہو جائے (یہاں کے قوانین عجیب و غریب اور سخت بھی ہیں)، انہوں نے اپنے فرزند حامد علی صاحب کے دفتر کا ایڈریس بتایا۔ اب اس کی تلاش شروع ہوئی ـــــ یہ دو ڈھائی گھنٹے جس گھٹن اور تذبذب کی سی حالت میں گزرے۔ کچھ نہ پوچھئے! ایک دفعہ تو

غلام قادر کے منہ سے یہ فقرہ بھی نکل گیا۔ کہ "مجبوراً ہمیں واپس مدینے جانا پڑے گا"۔ میں سوچتا تھا۔ سیٹ کا انتظام ۱۹ر فروری کا ہو چکا ہے۔ ٹکٹ اور ویزا شیخ محمد علی صاحب کے پاس ہے جو نایاب ہو رہے ہیں۔ مدینے جا کر میں کیا کروں گا؟ آخر اس ناکام دوڑ دھوپ کا انجام کیا ہوگا سہ

"یاد تھیں جتنی دعائیں صرف "گردش" ہو گئیں۔

بیت محمد علی

اللہ تعالیٰ نے دل کی خاموش فریاد قبول فرمائی اور حامد صاحب کا دفتر اور پھر خود حامد صاحب مل گئے۔ وہ ہماری موٹر میں بیٹھ گئے۔ اب ہم ان کی رہنمائی اور معیت میں ان کے گھر کی طرف رواں دواں ہیں شکر ہے کہ پہنچ گئے اور شکرانے کے نفل ادا کئے۔ بہت بڑی جنبش سے جان چھوٹی۔ عزیز گرامی غلام قادر صاحب کو بہت سی دعاؤں اور شکریے کے ساتھ رخصت کیا۔ اب میں شیخ محمد علی صاحب (کے خاندان) کے سپرد ہوں اور مطمئن ہوں۔ یہاں میری ہر ضرورت احتیاط سے پوری ہو رہی ہے۔ بڑی خوشی یہ ہوئی۔ یہ گھرانا دین دار ہے۔ محترمہ بیگم شیخ محمد علی صاحبہ کو نماز کی پابندی کے علاوہ تلاوت و اوراد و اذکار سے بھی گہری دلچسپی ہے۔ مجھ سے بعض وظیفوں سے متعلق اوراد مع ترجمہ لکھوائے اور حفظ کرائے۔ میزبانی کے فرائض جس خوش دلی اور سلیقے سے وہ اور ان کی بیٹیاں ادا کرتی ہیں۔ بہت کم خواتین کو ایسا ملکہ حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ اس خاندان کو شاد و آباد، خوش حال و خوش انجام رکھے۔

میں نے شیخ صاحب سے کہا ——— یہاں اور کوئی تاریخی یادگار ہے؟ اماں حوا کی قبر بتی جاتی ہے۔ اس کی زیارت کرا دیجئے۔ انہوں نے کہا وہ ختم کر دی گئی ہے۔ اس جگہ کوئی عمارت تعمیر کر دی گئی ہے۔ اگر آپ سمندر دیکھنا چاہیں تو رات کو حامد کے ساتھ چلے جایئے گا۔

بحیرہ عرب

رات کو کھانے سے فارغ ہو کر حامد صاحب مجھے اور چھوٹے بھائی اور بہنوں کو موٹر میں بٹھا کر سمندر کی طرف لے گئے جو قریباً دو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ کراچی کے کلفٹن اور کیماڑی کو دیکھنے والی آنکھیں اس تیرہ و تار اور بے رونق فضا میں سمندر کو ڈھونڈتی تھیں۔ کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کار سے نکل کر حامد صاحب کے ساتھ پیدل چل پڑا "سمندر کی تلاش میں" تھوڑی دور جا کر حامد صاحب نے انگلی کے اشارے سے بتایا وہ ہے سمندر ——— یہ خاموش اور رات کی تاریکی میں ڈوبا ہوا سمندر بحیرہ عرب ہے جو کراچی پہنچ کر گہما گہم رونق، دلکش بہت دلچسپ اور سیرگاہ بن جاتا ہے۔

۹ر فروری ۱۹۸۲ء شام کے بعد حامد علی صاحب نے مجھے ایئرپورٹ پر پہنچایا اور قانونی رسوم ادا کرنے میں مدد کی۔ مجھے انتظار گاہ کے سپرد کر کے دعائیں لیتے ہوئے واپس ہو گئے۔

½۱۰ بجے شب طیارہ فلک پرواز ہوا اور صبح چھ بجے کراچی پہنچا - اس طرح یہ بابرکت سفر انجام پذیر ہوا - الحمدللہ
اللہ تعالیٰ کا شکر اول و اقدم ہے کہ وہ مسبب الاسباب اور اپنے بندوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کی تحریک و توفیق دینے والا ہے —— اس کے بعد ان تمام کرم فرماؤں کے شکریئے سے بھی اپنے دل کو معمور پاتا ہوں جو راولپنڈی سے روانگی میں معاون ہوئے - اور پھر وہ جنہوں نے کراچی میں تعاون دیا - بعد ازاں جدہ، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے جن اصحاب نے اپنی کرم فرمائیوں سے نوازا - حدیث میں ہے - من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ (جو انسانوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ کی شکر گزاری بھی نہیں کرتا) - اور وہ سمندر پار بیٹھے ہوئے محترم (لندن والے حکیم غلام نبی صاحب اور تھائی لینڈ بنکاک والے مجید جانی صاحب) جن کو اللہ نے نیز نوازی کے لئے چن لیا سب کا دلی شکریہ —— سب کے لئے دلی دعائیں ہیں ؎

"حافظ وظیفہ، تو دعا گفتن است و بس"

قارئین کرام سے رخصت ہونے سے پہلے دو باتیں جو آخر میں یاد آئی ہیں - وہ بھی عرض کر دیتا ہوں - شاید کسی قلب منیب میں اتر جائیں -

۱:- ہسپتال سے رخصت کے وقت دل سے نکل کر زبان پر یہ فقرے جاری ہو گئے (یہاں کچھ تفصیل کی جا رہی ہے) مدینہ منورہ پہنچنے کے لئے پاسپورٹ، ویزا، مصارف و مصائب سفر کا سامنا ناگزیر ہے - لیکن قرآن حکیم، اسلام اور اولین مبلغ قرآن حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کتنا عظیم احسان ہے مسلمان پر (جو شاید کسی اور مذہب کے ماننے والے کو مشکل سے ہی حاصل ہوتا ہوگا) کہ انہوں نے اس کو اللہ تعالیٰ سے اتنا قریب کر دیا کہ اس کے پاس پہنچنے کے لئے کسی اجازت نامے کی ضرورت نہیں - سفر کی کوئی کوفت نہیں، کسی چوکیدار کا ممنون احسان نہیں ہونا پڑتا - جب بھی بندۂ مسلم چاہے - دن ہو یا رات اور جہاں بھی چاہے مسجد ہو یا کوئی اور جگہ، سفر ہو یا حضر اپنے رب تعالیٰ سے ملاقات کر سکتا ہے، اس کو پکار سکتا ہے - اس کے ساتھ اپنے دل کی باتیں کر سکتا ہے - یہاں تک کہ ایک ہی دن میں کئی کئی بار معراج کے مرتبے پر پہنچ سکتا ہے (الصلوٰۃ معراج المومنین) (حدیث) نماز مومن کی معراج ہے

اے پیغمبرؐ! جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں (تو تو جواب دے کہ) میں (اُن سے) قریب (ہی) ہوں
جب (بھی) دعا کرنے والا مجھے پکارے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں - (البقرہ ع ۲۳)
سو چاہیئے کہ وہ بھی میرے احکام کو مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں - تاکہ وہ ہدایت پائیں —— یعنی اگر ہم چاہتے

ہیں کہ وہ ہماری التجا کو قبول فرمائے تو اس سے پہلے ہم پر لازم ہے کہ ہم اس کے حکم کو تسلیم کریں۔ کیونکہ اس میں ہمارا ہی بھلا ہے۔ قُرب و معیت الٰہی کے متعلق آیات و احادیث کا اتنا وافر ذخیرہ ہے کہ اس پر ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ چنانچہ بعض بزرگوں نے اس موضوع پر کتابیں لکھی ہیں۔

دعائے یوسفؑ | حضرت یوسفؑ کی آخری دعا یاد آرہی ہے۔

اے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والے! تو ہی دنیا و آخرت میں میرا مددگار ہے۔ مجھے اپنی فرماں برداری کی حالت میں وفات دے اور صالحین کے ساتھ ملا دے۔ (یوسف ع ۱۱)

وہ جو ساری کائنات ارضی و سماوی کا خالق و مالک و منتظم ہے۔ کیا وہ اپنی اس چھوٹی سی مخلوق (انسان) کے لئے کافی نہیں؟ کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو کافی نہیں؟ (زمر ع ۴) ۔ آیت میں "اپنا بندہ" فرمایا ہے۔ کاش ہم اس "اپنائیت" کی قدر پہچانیں! دعائے یوسف میں اللہ تعالیٰ کی ولایت (مددگاری) دنیا و آخرت دونوں پر حاوی ہے۔ جیسے وہاں (بقول قرآن) کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا۔ ویسے ہی یہاں دنیا میں بھی حقیقی مددگار وہی ہے۔ اور مادی اسباب و ذرائع اور افراد جن سے ہم کام لیتے اور مدد حاصل کرتے ہیں۔ ان سب کا بھی خالق و مالک وہی ہے۔ وہی ان ذرائع کو مؤثر یا غیر مؤثر کرنے والا ہے ——— یہ کتنی بڑی سعادت، کتنی بڑی نعمت اور کتنی عظیم برکت ہے جو قرآن حکیم اور اسوۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کر کے ہر مسلمان حاصل کر سکتا ہے —

—— کبھی کبھی مشکلات کے وقت بزرگوں سے حاصل کئے ہوئے طریقے کے مطابق قرآن مجید سے تسکین حاصل کرتا ہوں۔ یہ بھی دعا ہی کی ایک قسم ہے۔ جو عموماً قبول ہو جاتی ہے اور کبھی (بظاہر) مستجاب نہیں ہوتی — آشوبِ چشم نے کئی ہفتے معذور کئے رکھا۔ دل نے سوچا۔ آخر کب تک اس حالت میں مبتلا رہوں گا؟ مزدور آدمی ہوں۔ آنکھوں کی صحت کے بغیر اپنا کاروبار نہیں چلا سکتا؟ انہی سوالات و خیالات میں۔ قرآن حکیم کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہاں سے یہ جواب ملا۔ مت ڈر! ہم جلدی ہی اسکو پہلی حالت میں لوٹا دیں گے (طٰہٰ ع ۱)

(یہ آیت مجید عصائے موسیٰ کے متعلق ہے جب کہ وہ سانپ کی طرح حرکت کر رہا تھا)

کراچی میں آیا تو محترم ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب آشک سے فون پر بات کی۔ انہوں نے اپنے ایک آئی اسپیشلسٹ پروفیسر دوست سے بات کر کے مجھے بلایا۔ ان کے علاج سے اللہ تعالیٰ نے چار پانچ ہی دن میں اس قابل کر دیا کہ ...
(نزول آب کے باوجود) تھوڑا بہت لکھ پڑھ لیتا ہوں۔ — محمد لطف علی زاہد۔

شکر خدائے را کہ تواند شمار کرد ۔۔۔ یا کیست آں کہ شکر یکے از ہزار کرد؟

شکر نعمت ہائے تو چنداں کہ نعمت ہائے تو ۔۔۔ عذر تقصیرات ما، چنداں کہ تقصیرات ما

فروری ۸۳ء کی کسی آخری یا مارچ کی کسی ابتدائی تاریخ کو یہ سفرنامہ مکمل کر کے کراچی کے موقر ماہنامے کے مدیر صاحب کو دے دیا۔ انہوں نے پڑھا اور پسند فرمایا اور کہا کہ جون کے پرچے میں شائع کر دیا جائے گا۔ جون گزر گیا اور مقالہ شائع نہ ہوا۔ ان سے دریافت کیا تو فرمایا۔ ذوالحجہ میں شائع ہوگا۔ دن گزرتے گئے۔ آخراں کے دفتر میں حاضر ہوا تو معلوم ہوا کہ نومبر ۸۳ء میں چھپ سکے گا۔ ان سے واپس لے لیا اور خیال آیا کہ ایک دفعہ اول سے آخر پڑھ کر دل کو مطمئن کر لیا جائے۔ پڑھا تو معلوم ہوا کہ تاخیر میں بھی حکمت تھی سو

تو کار غیب ندانی کہ چیست خردہ مگر ۔۔۔ کہ جز بمصلحتے نشکند سفینۂ ما

مسودے میں بہت سی خامیاں نکلیں جو بہ تقاضائے عمر ضعف حافظہ رہ گئی تھیں ان کی تصحیح کی اور ایک واقعہ کا ذکر ہی بھول گیا تھا۔ وہ حسب ذیل ہے۔

میں نے ڈاکٹر محمود حسین صاحب سے کہا کہ "جنت البقیع" دیکھنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے فرمایا کہ حرم شریف میں نماز جمعہ ادا کر کے باب جبریل پہ پہنچ جانا۔ وہاں سے حسب مقام کی طرف چلیں گے۔ چنانچہ میں نماز کے بعد باب جبریل پر پہنچ گیا تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر صاحب بھی آ گئے۔ ان کے ساتھ ایک اور صاحب بھی مشتاق زیارت تھے۔ ہم تینوں چل پڑے۔ چلتے چلتے ایک گلی میں گزر ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم روزانہ اس گلی سے گزر کر جنت البقیع جایا کرتے تھے۔ چلتے ہوئے ایک مکان کے پاس پہنچ کر کھڑے ہو گئے۔ اور کہا کہ یہی مکان ہے جہاں سے بڑھیا روزانہ حضورؐ پر کوڑا کرکٹ پھینکا کرتی تھی۔ لیکن اب وہ ایک پختہ مکان بن بدل چکا ہے۔ (یہ واقعہ تو مکہ معظمہ کا ہے۔ معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب کی روایت کا ماخذ کیا ہے) تھوڑا آگے بڑھے تو ایک مکان کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ فلاں صحابی (نام یاد نہیں رہا) کا مکان ہے۔ (یعنی اس جگہ ان صحابی کا مکان تھا) ایسی ہی کئی غیر مستند باتیں سننے دیکھنے میں آتی رہیں۔

جنت البقیع پہنچے تو پھاٹک بند تھا۔ باہر ہی کھڑے ہو کر لوگ زیارت کرتے اور فاتحہ خوانی کر رہے تھے قبریں تو دو ایک ہی نظر آئیں۔ باقی زمین کے برابر کر دی گئی ہیں۔ اسی طرح مکہ کے قبرستان جنت المعلّٰی میں باہر ہی سے فاتحہ پڑھا جاتا ہے اور امیر حمزہ رضؓ اور ایک صحابی کی قبر کے سوا اور کوئی قبر نظر نہیں آتی۔

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

شوق ماہری

بہار شوق، سرور نظر، قرار دل
تمام رحمت پروردگار ہے قاتل

ستم شعار نے کیا مُسکرا کے دیکھ لیا
رہائی اور اسیروں کی ہو گئی مشکل

ہم اپنے زخم دکھانے سے یوں بھی ڈرتے ہیں
خدا نہ کردہ پشیمان ہو کہیں قاتل

دلوں کو چھوتی رہی پھر بھی آنچ جلوؤں کی
ہزار پردے رہے درمیاں میں حائل

ستم پرست کو جب تک خدا نہ دے توفیق
تمام عرض و گزارش ہے سعیٔ لاحاصل

وہ بے نیاز ادھر مڑ کے کس لئے دیکھے
ہمارا حال کہاں التفات کے قابل

فراق[1] و فضلی[2] و احسان[3] اٹھ گئے اے شوق
چراغ بجھ گئے تاریک ہو گئی محفل!!

[1] فراق گورکھپوری [2] فضل احمد کریم فضلی [3] احسان بن دانش مرحوم

قطعہ — طارق رام پوری

طلب کوثر و تسنیم نہیں کرتے ہم...
ہم کو ساقی سے جو مل جاتی ہے پی لیتے ہیں
آپ کو حضرتِ زاہد ہوں مبارک حوریں
آدمی زاد کو ہم دیکھ کے جی لیتے ہیں

غزل

خوشبوئے زلفِ یار کی باتیں — ہر گھڑی گل عذار کی باتیں
ان کا دل موم ہو گیا سن کر — دیدۂ اشکبار کی باتیں
غنچۂ دل کھلا گئیں طارق — اک گلِ نو بہار کی باتیں

سالک رحمانی

جلوۂ حسن ہے کیا ہوشربا الا اللہ
کھو گئے راہ میں اربابِ وفا الا اللہ

طبعِ آزر نے تراشے ہیں ہزاروں اصنام
ابنِ آزر کا مگر ایک خدا الا اللہ

عشق ہر گام شبک سیر ہے منزل بہ کنار
قافلہ عقل کا ہے بانگِ درا الا اللہ

زندگی وقفۂ موہوم سہی شوخ تو ہے
کتنی رنگین تھی آدم کی خطا الا اللہ

ہوں اگر قلب و جگر سوزِ یقیں سے محروم
گرمیٔ فکر و عمل ایک خطا الا اللہ

رفعتِ ماہ و ثریا پہ رسائی بے سود
بر سرِ کار ہے جب زعمِ انا الا اللہ

کون اب محرمِ اسرارِ جنوں ہے سالک
شش جہت سے یہی آتی ہے صدا الا اللہ

اطہر عنایتی رام پوری

جو تیری آنکھ کبھی اپنے غم میں تر دیکھوں!
بقولِ درد میں سو سو طرح سے مر دیکھوں

وہ آدمی ہے تو چاہوں تمام عمر اسے
اگر ہے خواب تو میں خواب عمر بھر دیکھوں

کبھی تو ٹوٹے فسون بے چراغ راتوں کا
کبھی تو دن کے اُجالے میں اپنا گھر دیکھوں

اسی جنوں نے تو شاعر بنا دیا اطہر
کہ اپنا شعر کسی کی زبان پر دیکھوں
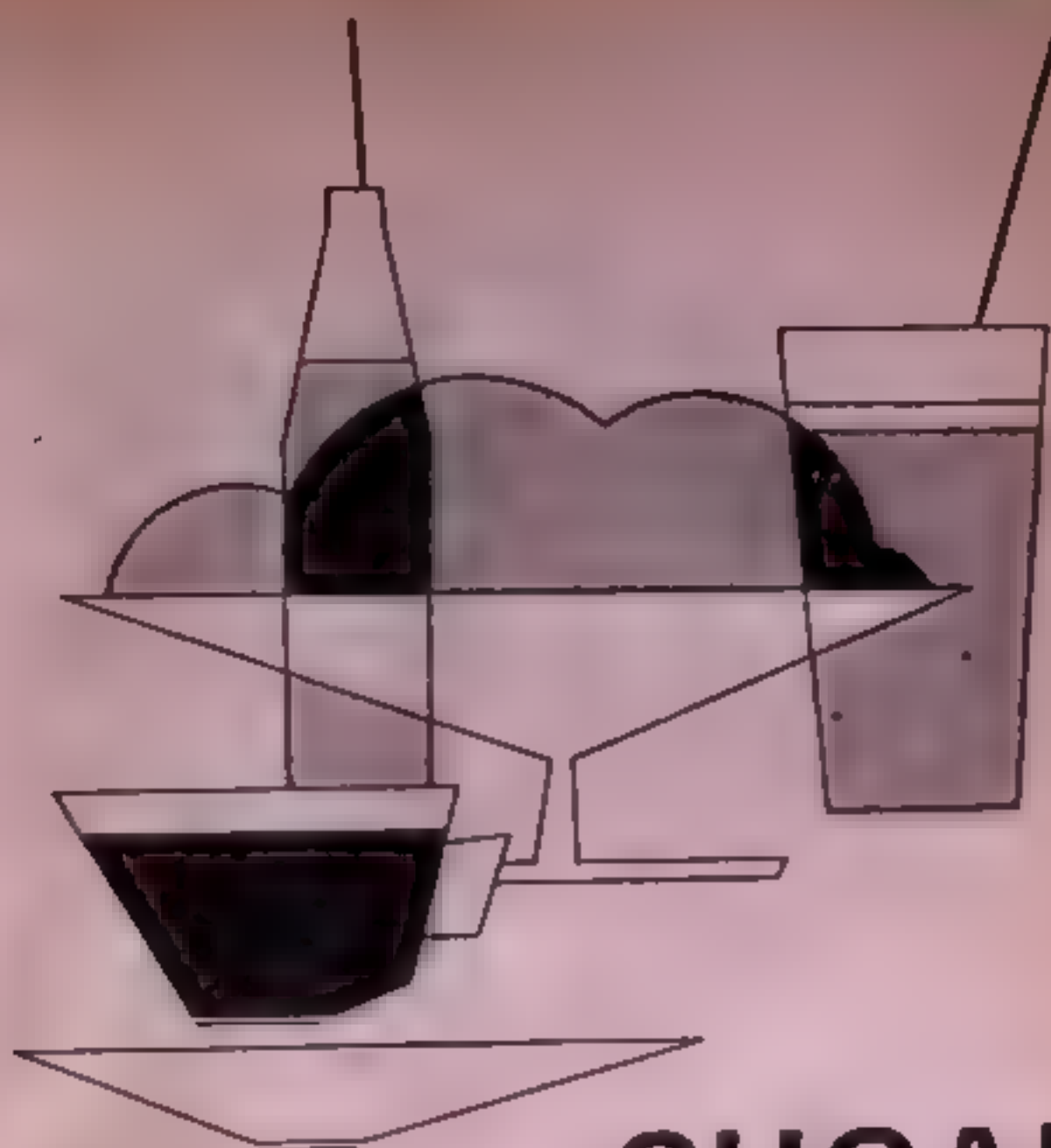
ہیبت سے تیری دلکشی بے پناہ کی
گنبد پہ کانپتی ہے کرن مہر و ماہ کی

ایلورا

یہاں جو سیر کو فکرِ رسا نکلتی ہے ...
وفورِ شوق میں پربت کی سانس چلتی ہے

وجد ... کا لیکن سب سے زیادہ روشن پہلو فکر کی یک رنگی (CONSISLECY) اور طرزِ بیان کی ہم آہنگی ہے، جس ... اٹھائیے اسکو شروع سے آخر تک پڑھ جائیے، مرکزی تصور و تخیل میں کہیں ایک اشارہ بھی ایسا نہیں ملے گا جو کسی دوسرے ... کا غماز ہو۔ ایک نرم و نازک چشمہ یا پرشور اور پرجوش سیلِ فکر ہے جو آہستہ خرامی سے یا تیزگامی سے ساحلِ بحرِ عمیق کی طرف رواں دواں اور موجزن ہے۔

حیرت کا مقام یہ ہے کہ ایک طرف نظم کے میدان میں وجد انیس، چکبست اور جوش کے ہم عصر و ہم پایہ معلوم ہوتے ہیں اور دوسری طرف غزل کے ... میں ان کا سمندِ فکر ان بلندیوں کو مس کرتا ہوا ملتا ہے، جو معراجِ تغزل کے حاملوں ہی کو نصیب ہوتی ہیں۔ مرحوم ... حسرت بداونی نے ایک بار محفلِ شعر میں یہ کہا تھا کہ اگر شمالی ہند میں علی سکندر جگر پر اہلِ وطن فخر کرتے ہیں تو جنوب میں سکندر علی وجد بھی اہلِ نظر کی نظر میں کم مقبول نہیں۔

اس کامیابی کا اصل راز وجد کی غیر معمولی شگفتہ خیالی اور شگفتہ مزاجی ہے۔ انہیں کا لازوال مصرعہ ہے۔

؎ خوشیوں نے جو بخشے ہیں وہ غم یاد رہیں گے

شگفتگیِ طبع ہی غم و اندوہ کی برداشت اور معرفت عطا کرتی ہے اور اسی شگفتگیِ فکر و فن نے سکندر علی وجد کی غزل اور نظم دونوں کو حیاتِ جاوداں بخشی ہے۔

"انتخاب" واقعی ایک قیمتی اور دل پذیر تخلیق ہے ——— "مبصر"

چلتے چلتے وقتِ رخصت کہہ گئے
اب جو ارماں رہ گئے سو رہ گئے

اب تو اتنی بھی میسر نہیں میخانے میں
جتنی ہم چھوڑ دیا کرتے تھے پیمانے میں

حکیم ناطق لکھنوی مرحوم

یادِ رفتگاں

کامل القادری مرحوم

یارِ عزیز محسن شتے قرآن و حدیث دونوں کی رو سے واقعی "حسن" ہیں۔ خدا جانے کتنے نامی گرامی ادیبوں کے دوست اور غمگسار، اپنا خیال کم دوسروں کی فکر زیادہ۔ شفیق بریلوی مرحوم کی ارمغانِ نعت پہلی بار شائع ہوئی تو العمران میں ایک بیٹھک ہوئی... جان محفل تو حسن شتے ہی تھے لیکن مولانا عبدالقدوس ہاشمی، محترم عبداللہ یاس ندوی، اور کامل القادری مرحوم نے بھی نعت پر اظہارِ خیال کیا۔ کامل القادری مرحوم کو دیکھا تو پہلے بھی تھا لیکن رسمی تعارف اس روز ہوا۔ حسن شتے نے کرایا، اس کے بعد بار بار ملاقاتیں ہوتی رہیں وہ موتمر کے دفتر میں بھی آتے تھے جہاں اس زمانے میں حسن شتے کی نشست تھی اور جہاں ہر دوسری تیسری سہ پہر کو "جلیبیاں" کھائی جاتی تھیں اور العمران میں جہاں ان کا دورہ ہوتا رہتا تھا جعفر میاں مرحوم سے استفادے کے لئے ان ملاقاتوں میں ان کے جوہر کھلے۔

اپنی خود نوشت کے لحاظ سے وہ صوبہ بہار (ہند) کے متوطن تھے اُن کا خاندانی تعلق ایسے صوفی خاندان سے تھا جو دنیوی اور دینی دونوں حیثیتوں سے معزز و محترم تھا، اسکول کی تعلیم علی گڑھ میں ہوئی اسی اثناء میں پاکستان بنا تو کراچی آگئے پھر کوئٹہ چلے گئے، حصول معاش کے لئے کام بھی کرتے اور پڑھتے بھی رہے تاآں کہ ۱۹۷۲ء میں ایم اے کر لیا۔

اسکول ہی میں شعر و شاعری کا شغل شروع کر دیا تھا۔ اسی بناء پر کچھ صحافت سے دلچسپی ہوگئی اور اسی میں ڈپلوما لے کر چند روز بمبئی کرانیکل، مسلم اور خلافت بمبئی میں کام کیا، پاکستان آئے تو صحافت ہی کو پیشہ بنا لیا اور بہت سے روزناموں اور ہفت روزہ رسائل سے منسلک رہے۔ خوب سے خوب تر کی جستجو نے کہیں ٹھہرنے نہ دیا، ربع صدی سے زیادہ وہ کوئٹے میں رہے پیشہ صحافت رہا اور مشغلہ شعر و شاعری تو بلوچستان کے ارض و سما کی وسعتیں ان کے دل و دماغ پر چھاگئیں اور بلوچی زبان و ادب، تہذیب و تمدن، تاریخ و ثقافت سے ان کی دلچسپی اس قدر بڑھی کہ اس علاقے کی زبانوں، ثقافتوں اور باشندوں کی تاریخ و تہذیب کے تجسس میں انہوں نے ایک عمر گذاری اور متعدد کتابوں کو مرتبہ کیا جو مختلف اداروں نے شائع کیں۔

لیکن اردو اُن کی آبائی زبان تھی اور اپنی اُٹھان اور اولین تربیت کے تعلق سے جسکا بھی کچھ کم نہ تھا اسمیں بھی شاعری کی، مضامین اور مقالے لکھے۔ ریڈیو کے نیوز بلیٹن مرتب کئے اور پڑھے اور اردو اور بلوچی ادب اور ادیبوں کے تقابل و تجاذب کے بارے میں پرمغز تالیفات مرتب کرنے کا سہرا بھی کامل القادری مرحوم ہی کی پیشانی پر سجتا ہے۔

بلوچستان میں اوّل اوّل اُن کی مخالفت ہوئی اور اُن کی ادبی معروفیتوں اور دلچسپیوں کو اہلِ بلوچستان، بلوچی سرداروں نے شک و شبہ کی نظر سے دیکھا لیکن کامل القادری کے عزم و اخلاص کے سامنے تعصب و تنگ نظری کی یہ دیواریں نہ ٹھہر سکیں اور بالآخر ان کے مخالفین نے بھی اُن کی صلاحیتوں اور استعداد کا برملا اعتراف کیا اور خطۂ بلوچستان کے لوگوں اور بولیوں کی تحقیق و تدقیق کی ذمے داری بخوشی ان کے سپرد کردی جسکو مرحوم نے بخوبی نبھایا اُن کی تالیفات و تصانیف کی طویل فہرست اس دعوے کا مسکت ثبوت ہے۔

کامل القادری مرحوم کا ادبی کام کیفیت و کمیت ہر دو اعتبار سے گراں مایہ ہے، تقریباً بیس کتابیں بلوچی اور براہوی ادب پر، اور بلوچستان کی تاریخ پر اور بلوچی قبائل کے رسم و رواج پر مطبوعہ ہیں اور کم و بیش اسی قدر مسودے ہنوز کتابت و طباعت کے منتظر ہیں ان میں "اقبال کا شعور مزاح" "اردو واسوخت" جیسے خالص علمی موضوعات بھی شامل ہیں اور اسی سے مرحوم کی کاملیت اور جامعیت کا سراغ ملتا ہے۔

اللہ تبارک تعالیٰ اُن کی مغفرت کرے اور اُن کے پسماندگان و احباب کو اسکی توفیق اور حوصلہ دے کہ وہ ان کے کام کو محفوظ کریں اور آگے بڑھائیں ——— مدیر فاران

مُفردات

روشن دلاں خوشامد شاہاں نہ کردہ اند
آئینہ عیب پوش سکندر نمی شود!

روشن دلاں حباب صفت دیدہ بستہ اند
روزن چہ احتیاج اگر خانہ تار نیست

سُن تو سہی زمانے میں ہے ترا فسانہ کیا

مخدوم و محترم مینائی صاحب! سلام و رحمت

فاران (ستمبر ۸۳ء) ملا۔ سب کام چھوڑ کر اس کے اوراق میں مستغرق ہو گیا۔ "نقش اول" پر رقت طاری ہو گئی ہے

سہ میں نے یہ سمجھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔

محترم خسروی صاحب کا "اسلامی مساوات و حقوق مرد و زن" اور "اللہ اکبر" بہت خوب ہیں۔

"قتیل شفائی" کے شعر ذیل سہ

کچھ لوگوں سے جب میری ملاقات نہیں تھی
میں بھی یہ سمجھتا تھا... خدا سب سے بڑا ہے

پر ان کی تنقید برحق و بجا ہے۔ ممکن ہے کہ شاعر نے ان لوگوں پر طنز کیا ہو جو خدا سے بڑے بنے پھرتے ہیں اور اس ذات پاک تعالیٰ کو فرعون (والعیاذ باللہ) کی طرح خاطر میں نہیں لاتے۔ تاہم ایسی شاعری سے اجتناب ہی اولیٰ ہے۔ کتابوں پر آپ نے جو تبصرے کئے ہیں نہایت محتاط اور صحیح ہیں۔ لیکن مجھے جس تبصرے نے بہت متاثر کیا وہ "سرسید کی کہانی...." ہے۔ ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری محقق اور صاحب معلومات ہیں۔ تعجب ہے کہ ان کو سرسید کا صرف ایک گوشہ دکھائی دیا۔ اور دوسرے تمام گوشے جو معلمانہ شان سے امت مسلمہ ہند کے تمام شعبہ ہائے حیات پر چھائے ہوئے ہیں ان کی نظر سے اوجھل رہے۔ آپ نے ان کی نشان دہی کر کے صرف علمی و تاریخی تحقیق کا حق ادا نہیں کیا۔ بلکہ ایک کار ثواب انجام دیا ہے۔ نام نیک رفتگاں کی ایسی خدمت یقیناً ایک عمل صالح ہے ایک مخلصانہ عبادت ہے۔ آپ کے اخلاص، تدین اور انصاف پسندی پر دل سے تحسین و آفرین کی صدا نکلتی ہے سہ

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

و ایدک اللہ بروح منہ۔ تقسیم ملک سے قبل میں کراچی پہنچ گیا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک تقریباً ہر سال دو۔ دو۔ تین تین مہینے کراچی میں قیام رہا۔ لیکن گزشتہ فروری سے اگست تک کا قیام تمام گزشتہ ادوار سے زیادہ تعمق، زیادہ دلچسپ اور زیادہ بابرکت رہا۔ خصوصاً دو وجہ سے۔ ان میں سے ایک یہ کہ مینائی خاندان اور مینائی تبرکات کی زیارت سے مستفید ہوا۔ آپ کے برادر صغیر جناب ... مینائی (اسم گرامی یاد نہیں رہا۔ حافظہ بوڑھا ہو گیا)

اور ان کے صاحب زادے اور ان کے اہل بیت سب ہی میرے لئے قابل احترام ہیں بالخصوص ان کے پاس جو حضرت امیر مینائیؒ
اور ان کے محترم فرزند (آپ کے والد رحمۃ اللہ علیہ) کی تصاویر، ان کے خطوط اور حضرت امیرؒ کا فارسی دیوان انکے اپنے
قلم سے لکھا ہوا میرے لئے، بلکہ ملک بھر کے علمی حلقوں کے لئے ایک اہم انکشاف کا مرتبہ رکھتا ہے۔ حیرت ہوئی کہ ابتک
ایسا خزانہ مکنون کیسا مکشوف کیوں نہیں ہوا۔ حضرت امیرؒ کی فارسی کسی اہل زبان کی فارسی سے کم مرتبہ نہیں رکھتی اور
اس میں ان کا تخیل اردو سے بھی زیادہ باوقار و بارعب معلوم ہوتا ہے خدارا اس کو منصۂ شہود پر لائیے۔ اور اتلاف سے
بچائیے۔ ۵۷ء کے لوٹ اور ہنگاموں سے آپ لوگوں نے اسکو بچا کر رکھا ہے اس کے لئے آپ شکریہ کے مستحق ہیں
خصوصاً اس وجہ سے بھی کہ بھارت میں ہمارے بہت قیمتی کتب خانے ہندو تعصب کی نذر ہوئے جن میں میرا اپنا کتب خانہ
بھی جو نوادر پر مشتمل تھا تباہ ہوا۔ آزاد دہلوی دیوان ذوق "غدر" کی تباہ کاریوں سے بچا کر لے آئے اور آپ دیوان
فارسی امیرؒ ــ یہ بہت بڑی دولت ہے۔ اس کی اشاعت کا انتظام ہونا چاہیئے اور اس پر ایک بھرپور مقدمہ محاسن کلام
اور فضائل مصنفؒ سے متعلق ہونا چاہیئے۔ یہ کام سید محمد عبدالرشید فاضل صاحب اپنے ذمہ لیں۔ یا اور کوئی صاحب
آپ کے احباب میں سے یا ڈاکٹر ریاض صاحب۔

دوسری بات جناب کے قیام کراچی میں قابل ذکر ہے۔ وہ جمعہ وار درس قرآن کی مجلس ہے جسمیں حضرت
جعفر شاہ پھلواری صاحب مدرس تھے۔ ان کے بعد اب بھی سلسلہ درس جاری ہے اور اہل علم حضرات باقاعدہ جمع ہوتے
ہیں اور قرآن حکیم پر مذاکرات ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک کراچی کا یہ گوشہ بھی نہایت قابل قدر ہے۔

ص ۴۳ سطر ۱۲ "انسان کے جسم میں اللہ کی ذات کا حلول" اور ص ۴۳ سطر ۳ "دل بدن" محل نظر ہیں۔

آخر میں آپ کے التفات خصوصی کا شکریہ خصوصی دل وجان سے، لیکن اصل بات یہ ہے کہ ؎

"آپ اچھے ہیں جو کہتے ہیں جلالؔ اچھا ہے"

عرشی
ضلع ساہیوال

سلام مسنون!

"فاران" اور "اسلامک آرڈر" باقاعدگی سے مل رہے ہیں۔ اس عنایت کے لئے مشکور ہوں۔ "فاران"
کے ماہر نمبر میں عدم شرکت کا افسوس ہے، مگر وقت کی تنگی مانع تھی۔ جس کی معذرت میں پہلے ہی پیش کر چکا ہوں۔
ماہر نمبر خوب رہا۔ سبھی مضامین قدر و اہمیت کے حامل ہیں۔ جناب حبیب احمد صدیقی کا مضمون "مولانا ماہر القادری ـ
نظر سے" ایک جامع اور وقیع مضمون ہے۔ ایسے مضمون کی ترتیب کے لئے جس محنت اور دقت نظر کی ضرورت ہے،

ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ صدیقی صاحب ہی کا حصہ ہے۔ "مولانا ماہر القادری کی یاد میں" پروفیسر سید عبدالرشید صاحب فاضل کا مضمون اگرچہ مختصر ہے، مگر بہت دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔

"اسلامک آرڈر" شمارہ دوم کے مضامین بھی فکر انگیز ہیں۔ "اسلام میں عورت کا مقام" اور "اسلام اور ضبط تولید" اگرچہ پامال موضوعات ہیں، مگر بایں ہمہ ان کی اہمیت سے انکار نہیں ہے۔ ان موضوعات پر فتح محمد سندیلا اور محمد سمیع اللہ صاحبان کے مضامین متوازن ہیں اور ان میں ان موضوعات کا غیر جانبدارانہ تجزیہ کر کے قرآن و سنت کی روشنی میں صحیح نتائج تک راہ نمائی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے بھی فکر انگیز گفتگو کی ہے اور اسلام میں ملکیت کے تصور کو بہت خوبی سے واضح کیا ہے البتہ "جمہوریت اور اسلام" مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ تشنہ بھی ہے یہ موضوع مزید تفصیل و تجزیہ کا متقاضی ہے۔

وارث سرہندی سیالکوٹ

محترم بھائی تسنیم مینائی صاحب! سلام مسنون

شمارۂ اگست موصول ہوا۔ اب کے نقش اول کا "اجمال" ہزاراں ہزار "تفاصیل" کا آئینہ دار اور "دریا بہ حباب اندر" قسم کی سطح کا شاہکار ہے! خوب لکھا ہے مفہوم کا حق ادا ہوا، معانی کا تقاضا بجا ہوا ــــــ مختصر ہے تو کیا ہوا!؟۔ ارباب سیرو ورزش "پہلی دوڑ" ہی میں "کھُل کر پسینہ لانے کو" اصول حکمت کی رُو سے ناپسند خیال کرتے ہیں یہی کلیہ نقش اول کی ترتیب و تہذیب میں اگر مستقلاً بھی پیش نظر رکھ لیا جائے تو "یک حرف محرمانہ بس است" اور "طلوع صبح دانائی" کے آثار سے عبارت ہوگا۔ میرا خیال ناقص و کمتر تو یہ ہے کہ آپ کے دراز الدراقسم کے رموز و نکات آشنا ذہن سے "رمز و اشاریت کے ابریشم میں لپٹی ہوئی بات بھی "کلمۂ خیام" سمجھی جانی چاہیئے درآنحالیکہ اسی عنوان کے تحت آپ کی جرأت انشاء پردازی نے یہ بات واشگاف طور پر ہمارے سامنے رکھ دی ہے ؎

مجھے گر یاد ہیں قطرے کو طوفاں کر دکھانے کے
کسی ذرّے کو وسعت میں بیاباں کر دکھانے کی

لہٰذا آپ کا مختصر اداریہ بھی زوردار بہاؤ اور دلوں سے اُتر جانے والا کٹاؤ رکھتا ہے اور ؎

جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ!

خمستان فاران سے ابھی ایک ہی بار "جرعۂ زلال و صافی" حلق سے اترا ہے اور "بتمنر عرض ہنر" کا یہ عالم کہ کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا "نخوت" کے مارے زمیں پر پاؤں نہیں دھرتا.......

(فاران میں چھپا ہوں فاران میں!) خطا معاف — اپنے "ظلِ عاطفت" سے کچھ ایک "حریصِ شہرت" سے ذرا "دامن کشاں" رہیے — مبادا زمیں — "زمیں نہ آسمان" "آسمان" رہیے —! فاران ہاتھ میں لئے ادبی مرغزاروں میں "ڈکراتا" پھرتا ہوں ذرا کسی نے کوئی ایسی ویسی بات کی اور ادھر سے "لپا" "آیا" "میاں" تک بند! ادب لگاہدار یہ ماہدولت ہیں "کہتے کہتے فاران کا شمارہ اگست عینک کی طرح آنکھ پر لگادیا — چنانچہ وہ چیخ اٹھتے ہیں سو

خود نہ تھے سرکش و طنّاز، بنایا تم کو
طُرّۂ زُلفِ دوتا نے تجھیں ہم جانتے ہیں

امید کہ آپ ہر طرح مع الخیر ہوں گے والاعزت! شمارۂ جولائی تک ابھی ہمارا مقدّر رسا نہیں ہوا۔ اول فرصت میں کرم کیجئے۔ اندرون خانہ دعوات

محمد شاکر عروجی
مدیر اعلیٰ ماہنامہ مرجع ۸۹۸، بی پیپلز کالونی فیصل آباد

ings, and a Warner, an
one who invites to Allah's
by his leave and a

Karachi Port T

رجسٹرڈ ایس نمبر ۱۲۶۲

ماهنامه فاران کراچی

نومبر ۱۹۸۳ء

مدیر : اسمٰعیل احمد مینائی

۲۱۸ ۔ بہادر آباد ۔ کراچی ٹیلیفون ۴۱۴۳۱۲

بچت آپ کی ۔ محنت ہماری
نیشنل بینک آف پاکستان
قومی ترقی کا بینک

باني :- مولانا ماہر القادری

اس شمارے میں

"قرآن کریم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپکی دینی معلومات میں اضافہ کے لئے شائع کیجاتی ہیں انکا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہوں انکو صحیح اسلامی طریقوں کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں"

چندہ سالانہ پاکستان میں ـــــ ۵۰ روپے
" " ہندوستان و بنگلہ دیش میں ـــ ۱۰۰ روپے
" " دیگر ممالک سے ـــــ ۲۰۰ روپے

پبلشر ـــــ اسمٰعیل احمد مینائی

دفتر ماہنامہ فاران نمبر ۲۱۸ بہادر آباد کراچی

فاران کے تازہ شمارہ اور پرانے شمارے مندرجہ ذیل بکسٹال پر دستیاب ہیں۔

۱:- صدر ریگل کراچی

۲:- محمد سعید عوامی کتب خانہ، بولٹن مارکیٹ نزد لکشمی بلڈنگ کراچی

پبلشر اسمٰعیل احمد مینائی نے انجمن پریس کراچی سے چھپوا کر دفتر فاران، ۲۱۸ بہادر آباد کراچی سے شائع کیا۔ فون ۴۱۲۱۳

نومبر کا مہینہ اقبال کی پیدائش کا مہینہ ہونے کی مناسبت سے اقبال سے منسوب ہے اس شمارے میں اپنے آپ کو بیشتر مقالے اور منظومات اقبال کی شاعری اس کے پیام اور اس کی فکر سے متعلق ملیں گے، اس مہینے کے نقش اول کے لئے .... راقم الحروف نے روزنامہ جسارت کراچی کے جواں ہمت مدیر صلاح الدین کے اداریہ جسارت مورخہ ۹ر نومبر ۱۹۸۳ء کا انتخاب کیا ہے باقی ماندہ مندرجات کی باری اس کے بعد آئے گی ——————— مدیر فاران

مردِ حق آگاہ

"اقبال برصغیر کے اُس مردِ حق آگاہ کا نام ہے کہ جس کا ذریعۂ اظہار شاعری اور مقصدیات اُمت مسلمہ کی فکری نشاۃ ثانیہ اور سیاسی و تنظیمی شیرازہ بندی تھی۔ اس مردِ حق آگاہ نے محض برصغیر کے مسلمانوں کو ایک علیحدہ وطن کا خیال، مد اس کے طبعی و جغرافیائی حدود ہی کا تقرر نہیں دیا بلکہ اس نے اس ملک کے نظریاتی تشخص کے خد و خال کے بھی بڑے واضح اشارات دیئے۔ اس نے عہد جدید میں مسلمانوں کی سیاسی فکر کی تنظیم نو پر اپنی خاص توجہ مرکوز رکھی۔

یہی نہیں بلکہ اس نے تمام عصری تہذیبی فکری۔ اقتصادی اور سیاسی تحریکات کا تجزیہ ایک مومن مسلمان کے شعور و فہم کے ساتھ کیا اور اس تجزیئے کو اُمت مسلمہ کے فکری و سیاسی رائے کی نشاندہی کا ذریعہ بنایا۔ اقبال نے مغرب کی جمہوریت پر تنقید کی مشرق کی اشتراکیت کی کمزوریوں اور فساد کی نشاندہی کی، مسلمانوں کے سیاسی ماضی پر مسلط ملوکیت کے مہلکات بتائے۔ سرمایہ داری کی خود غرضیوں کو بے نقاب کیا۔ تسلطی نظاموں کی انسانیت بیزاری کو آشکار کیا۔ غرض یہ کہ ہر طور اللہ اور غیر اللہ کی حکومت کے فرق کو واضح کیا۔

آج جب پاکستان کے مسلمانوں کو اپنے سیاسی نظام کے سلسلے میں ایک بار پھر فکری انتشار کے دوراہے پر لا کھڑا کیا گیا ہے۔ فکر اقبال ہماری مثبت راہنمائی کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ مگر ہمارے ہاں تو ذوق سماعت کی تسکین کے لئے اقبال کو مغنیوں کے حوالے کر دیا گیا ہے اور یوں کلام اقبال کا فکری جوہر نئی نسل کے شعور سے اوجھل ہو گیا۔ بے روح اقبال پرستی کے مظاہر تو بہت دیکھنے میں آتے ہیں مگر فکر اقبال کو اس ملک کی نظریاتی تعمیر میں استعمال کرنے کا تجربہ نہ ہو سکا۔ مغرب کی روایات کے مطابق اندرون ملک اور بیرون ملک جامعات میں مسندِ اقبال کا قیام تو عمل میں آ گیا مگر تجزیہ اگر یہ ہو کہ

ایسے اقدامات سے فکرِ اقبال کی تبلیغ اور فکرِ اقبال کے قومی تعمیر میں عملی استعمال کے سلسلے میں کیا پیش رفت ہوئی تو کسی امید افزا جواب کی امید نہیں اشتراکیت، مغربی جمہوریت، استعماریت، ملوکیت، فسطائیت کے مقابلے میں اقبال نے اسلام کی سیاسی فکر کے بارے میں جو اشارات دیئے ہیں۔ کاش اُن کی تحقیق و تنظیم ہی کا کوئی کام ڈھنگ سے ہو جائے۔"

—— اسمٰعیل احمد مینائی

کتب برائے تبصرہ

۱:- جنرل خدا بخش لائبریری

۲:- قرآن کے تراجم کا تقابلی مقابلہ

۳:- فردوس ختم الرسلؐ - محمد واصل عثمانی

۴:- شبلی بلاد اسلامیہ میں - " "

۵:- توضیحی فہرست مخطوطات - مرتبہ فضل اشر فاروق ندوی

۶:- کتب خانہ ہمدرد جلد اول

۷:- فقہائے پاک و ہند جلد اول —— محمد اسحاق بھٹی

۸:- فقہائے ہند جلد پنجم حصہ اول —— " "

باقی صفحہ

عقیل یوسف صدیقی

"بحضور اقبال"

چرچا ہے ہر سمت تری دیدہ وری کا
آفاق میں شہرا تری بالغ نظری کا

تو کاشفِ اسرارِ خودی، صاحبِ ادراک
ہے فخر ستاروں کو تری ہم سفری کا

افکار ترے دیدۂ بینا کے لئے نور
سامان حکیموں کے لئے راہبری کا

اشعار ترے خستہ دلوں کے لئے مرہم
پیغام جوانوں کے لئے بے جگری کا
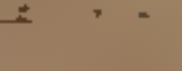
ملت نے مگر حیف تری قدر نہ جانی
ماتم ہے وہی کم نگہی بے بصری کا
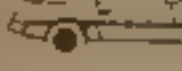
گم گشتہ و گم کردہ یہ ملت ہے ابھی تک
کر تو ہی مداوا کوئی اس بے خبری کا

طالب ہاشمی

صحابۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(۱)

۱:۔ حضرت ثابتؓ بن دحداح بلوی

صلح حدیبیہ (ذیقعدہ سنہ ۶ھ) کے بعد رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم واپس مدینہ منورہ تشریف لائے تو ایک دن آپؐ کو اپنے ایک صدق جاں نثار کی وفات کی خبر پہنچی۔ یہ خبر سن کر حضورؐ سخت ملول و محزون ہوگئے اور صحابہ کے ہمراہ جنازہ کے لئے تشریف لے گئے جب ان کی تدفین ہو چکی تو حضورؐ گھوڑا منگا کر سوار ہوئے اور فرمایا:۔

"جنت میں چھوہارے کی کتنی شاخیں ہیں جو ابنِ دحداح کے لئے لٹکائی گئی ہیں"۔

یہ ابن دحداحؓ جن کے جنتی ہونے کی لسانِ رسالتؐ نے بشارت دی، سیدنا حضرت ثابتؓ بن داحدح تھے۔

(۲)

حضرت ابوالدداح ثابتؓ بن دحداح کا شمار نہایت عظیم المرتبت صحابہ میں ہوتا ہے۔ ان کا تعلق قبیلہ بلیؓ کے خاندان عجلان یا انیف سے تھا جو قبیلہ اوس کی شاخ عمرو بن عوف کا حلیف تھا۔ نسب نامہ یہ ہے:۔

ثابتؓ بن دحداح بن نعیم بن غنم بن ایاس (بعض روایتوں میں حضرت ثابتؓ کے والد کا نام الدحداحۃ بھی آیا ہے) ہجرت کے بعد سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں نزولِ اجلال فرمایا تو اوس و خزرج اور اُن کے حلفاء میں جو لوگ ابھی تک نعمتِ اسلام سے محروم تھے وہ بھی بڑی سرعت کے ساتھ دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے۔

حضرت ثابتؓ بن دحداح بھی اسی زمانہ میں شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہوئے۔ کسی روایت سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ غزوۂ بدر سے پہلے مسلمان ہوئے یا بعد میں۔ بہر صورت غزوۂ بدر کے شرکاء میں ان کا نام نہیں ہے۔ سنہ ۳ھ میں غزوۂ اُحد پیش آیا تو اس میں حضرت ثابتؓ بن دحداح نے مجاہدانہ شرکت کی اور شجاعت کا حق ادا کر دیا۔ جس وقت

ایک اتفاقی لغزش سے جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور مسلمانوں میں انتشار پھیل گیا تو حضرت ثابت رضی آگے بڑھے اور پکار کر کہا۔

"اے گروہ انصار! ادھر آؤ! ادھر میں ہوں ثابت بن دحداح اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے تو اللہ زندہ ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا، تمہارا فرض ہے کہ دین کے لئے لڑو، اللہ تعالیٰ تمہیں غلبہ دینے والا ہے اور تمہاری مدد کرنے والا ہے۔"

حضرت ثابت رضی کی آواز سن کر چند انصاری جانباز اُن کے گرد جمع ہو گئے اور سب نے مل کر مشرکین کے ریلے کو روکا۔ دوسری طرف سے ایک اور ریلا آیا جس میں خالد بن ولید، عکرمہ بن ابوجہل، ضرار بن خطاب اور عمرو بن عاص جیسے قریش کے نامور جنگجو شامل تھے، ان لوگوں نے انصاری جانبازوں کو گھیر لیا۔ حضرت ثابت رضی اور ان کے ساتھیوں نے جم کر مقابلہ کیا اسی اثناء میں خالد بن ولید نے بڑھکر حضرت ثابت رضی کو نیزہ مارا اور وہ شدید زخمی ہو کر زمین پر گر پڑے۔ ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے اسی موقع پر جام شہادت پیا اور وہ غزوۂ احد کے سب سے آخری شہید تھے لیکن دوسری مستند روایتوں سے اس موقع پر ان کی شہادت ثابت نہیں ہوتی ان روایتوں کے مطابق لڑائی کے بعد زخمیوں اور شہداء کی تلاش کی گئی تو لوگوں نے دیکھا کہ حضرت ثابت رضی اگرچہ شدید زخمی ہیں لیکن ان کی سانس چل رہی ہے چنانچہ انہیں اٹھا کر مدینہ منورہ لے گئے۔ علاج سے زخم بظاہر مندمل ہو گیا اور کئی سال تک اچھے بھلے رہے لیکن صلح حدیبیہ کے بعد ایک دن یہی زخم پھر عود کر آیا اور اسی کے صدمے سے انہوں نے وفات پائی۔ وفات کے وقت کوئی اولاد زندہ نہیں تھی اور غالباً اہلیہ بھی وفات پا چکی تھیں اس لئے حضور ﷺ نے ان کا ترکہ ان کے بھانجے حضرت ابولبابہ رفاعہ رضی بن عبدالمنذر کو عطا فرمایا۔

(۳)

حضرت ثابت رضی بن دحداح کے گلشنِ اخلاق میں اخلاص فی الدین، انفاق فی سبیل اللہ، جوش ایمان اور جذبہ فدویت سب سے خوشرنگ پھول ہیں۔ اپنے انہی اوصاف کی بدولت انہوں نے بارگاہ رسالت میں درجۂ محبوبیت حاصل کر لیا تھا۔ حضرت عبداللہ رضی بن مسعود سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی۔

(کون ہے جو اللہ کو قرض دے، اچھا قرض تاکہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا کر واپس دے، اور اس کے لئے بہترین اجر ہے) الحدید

تو حضرت ثابت رضی بن دحداح حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا "یا رسول اللہ ﷺ، کیا اللہ تعالیٰ ہم سے قرض چاہتا ہے؟"

حضورؐ نے فرمایا "ہاں اے ابوالدحداح"۔

انہوں نے عرض کیا "یارسولؐ اللہ ذرا اپنا دست مبارک مجھے دکھایئے۔

حضورؐ نے اپنا دست مبارک ان کی طرف بڑھایا تو انہوں نے حضورؐ کا دست مبارک اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا

"اے اللہ کے رسولؐ میں اپنا باغ اللہ تعالیٰ کو قرض دیتا ہوں۔"

یہ باغ جو حضرت ثابتؓ نے راہِ حق میں صدقہ کر دیا کوئی معمولی باغ نہیں تھا بلکہ اس میں کھجور کے چھ سو درخت تھے اور اسی میں ان کا مکان تھا۔ حضورؐ سے یہ بات کر کے وہ سیدھے گھر پہنچے اور اپنی اہلیہ کو پکار کر کہا۔

"دحداح کی ماں گھر سے نکل آؤ میں نے یہ باغ اپنے رب کو
قرض دے دیا ہے۔"

ان کی اہلیہ (حضرت اُمِّ دحداح) بولیں:۔ "ابوالدحداح تم نے نفع کا سودا کیا ہے" یہ کہہ کر اپنا سامان اور بچے (دحداح) کو لے کر باغ سے باہر نکل آئیں۔ اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ثابت کا دحداح نامی ایک لڑکا تھا جو بعد میں ان کے سامنے ہی فوت ہو گیا تھا۔

ایک اور روایت میں جو حضرت انسؓ بن مالک سے مروی ہے یہ واقعہ ایک دوسری صورت میں بیان کیا گیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا "یارسولؐ اللہ میں اپنے مکان کی دیوار اٹھانا چاہتا ہوں۔ بیچ میں فلاں شخص کا کھجور کا درخت ہے اگر آپؐ اس شخص کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ یہ درخت مجھے دیدے تو میں اپنی دیوار کی ٹیک اس سے لگا کر دیوار بآسانی مکمل کر لوں گا۔"

حضورؐ نے اُس آدمی سے فرمایا کہ تم اپنا وہ درخت اس کو دے دو اس کے عوض اللہ تعالیٰ تمہیں جنت میں کھجور کا درخت عطا فرمائے گا۔

اس آدمی نے درخت دینے میں عذر کیا۔ حضرت ابوالدحداحؓ (ثابتؓ) کو معلوم ہوا تو وہ اس شخص کے پاس پہنچے اور اس سے کہا۔

"بھائی تم اپنا کھجور کا درخت مجھے دے دو اور اس کے عوض
میرا کھجور کا باغ لے لو۔"

وہ شخص اس بات پر راضی ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت ثابتؓ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔

"یارسول اللہ! میں نے اس شخص سے وہ کھجور کا درخت اپنے باغ کے
عوض خرید لیا ہے۔ یہ میں آپ کی نذر کرتا ہوں۔ آپؐ مکان کی دیوار
اٹھانے والے ضرورت مند کو دے دیجئے۔"

یہ سن کر حضورؐ بہت مسرور ہوئے اور کئی بار فرمایا "ابوالدحداح کے لئے جنت میں کھجور کے کتنے بڑے اور بھاری خوشے ہیں"۔

اس کے بعد حضرت ثابتؓ اپنی اہلیہ کے پاس پہنچے اور ان سے کہا۔

"اے اُمّ دحداح! اس باغ سے نکل جاؤ، میں نے اس باغ کو جنت
کے کھجور کے عوض بیچ ڈالا ہے"۔

سعادت مند بیوی نے کہا۔ "یہ تو بڑا نفع مند سودا ہوا"۔

علامہ ابن اثیرؒ نے "اُسدُ الغابہ" میں لکھا ہے کہ جب سورۂ الحدید کی اوپر بیان کردہ آیت نازل ہوئی تو حضرت ثابتؓ نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپؐ سے دریافت کیا۔

"یارسول اللہ کیا اللہ تعالیٰ ہم سے قرض مانگتا ہے؟"

جب حضورؐ نے اثبات میں جواب دیا تو انہوں نے اپنا مال صدقہ کر دیا۔

اس روایت میں مال کی تصریح نہیں کی گئی ہو سکتا ہے کہ حضرت ثابتؓ نے باغ کے علاوہ بھی کوئی مال صدقہ کیا ہو۔ بہرصورت یہ روایات حضرت ثابتؓ بن دحداح کے جوشِ ایمان اور اخلاص فی الدین پر دال ہیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

۲: حضرت انسؓ بن نضر انصاری

غزوۂ اُحد سے کچھ عرصہ پہلے[1] کا ذکر ہے کہ ایک دن بارگاہِ رسالتؐ میں ایک مقدمہ پیش ہوا ۔۔۔۔ ایک انصاری خاتون رُبیعؓ کے ہاتھ سے انصار ہی کی ایک لڑکی کا دانت ٹوٹ گیا تھا، اس لڑکی کے ورثاء مطالبہ لے کر بارگاہِ نبویؐ میں پیش ہوئے تھے۔ حضورؐ نے سارے حالات سن کر فیصلہ صادر فرمایا کہ "دانت کے بدلے دانت رُبیع کا دانت بھی توڑا جائے گا۔"

اس خاتون کے بھائی بھی وہاں موجود تھے ان کو اپنی بہن سے بے پناہ محبت تھی۔ اگرچہ وہ ایک سچے مسلمان اور سرورِ عالمؐ کے عاشقِ صادق تھے۔ لیکن بہن کی محبت کے جذبہ سے مغلوب ہو کر بے اختیار ان کی زبان سے

نکل گیا :-

"یارسول اللہ، خدا کی قسم، رُبیّع کا دانت نہ توڑا جائے گا۔"

حضورؐ نے فرمایا:- "بھائی اللہ کا یہی حکم ہے ہاں لڑکی کے ورثاء دیت لے کر اپنے مطالبہ سے دستبردار ہوجائیں تو دوسری بات ہے"

اس وقت رحمتِ خداوندی جوش میں آئی اور لڑکی کے ورثاء دیت لینے پر راضی ہوگئے - اس طرح ان صاحبِؓ رسولؐ کی پیاری بہن کا دانت بچ گیا۔ رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

"اللہ کے بعض بندے ایسے ہیں کہ جب قسم کھا بیٹھتے ہیں تو اللہ ان کی قسم پوری کر دیتا ہے"

یہ صاحبِؓ رسولؐ جن کی قسم کی لاج ربِّ ذوالجلال والاکرام نے رکھی اور محبوبِ رب العالمینؐ نے جن کے خاصانِ خدا میں سے ہونے کی تصدیق فرمائی، سیدنا حضرت انسؓ بن نضر انصاری تھے۔

(۲)

حضرت انسؓ بن نضر خزرج کے خاندان نجّار سے تھے۔ سلسلۂ نسب یہ ہے :-

'انسؓ بن نضر بن ضمضم بن زید بن حرام بن جندب بن عامر بن غنم بن عدی بن نجّار -

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی پردادی سلمیٰ بنت عمرو (حضرت عبدالمطلب کی والدہ) بھی اسی خاندان سے تھیں اور رشتہ میں حضرت انسؓ بن نضر کی پھوپھی تھیں اس نسبت سے حضرت انسؓ کا خاندانِ رسالتؐ سے بھی تعلق تھا۔ جلیل القدر صحابیہ حضرت اُمّ سُلیمؓ، حضرت انسؓ بن نضر کی بھاوج اور خادمِ رسول اللہ حضرت انسؓ بن مالک اُن کے حقیقی بھتیجے تھے۔

حضرت انسؓ بن نضر کا شمار بنو نجّار کے رؤساء میں ہوتا تھا۔ دولتِ دنیوی کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے انہیں فطرتِ سلیم سے نوازا تھا۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ منورہ میں نزولِ اجلال فرمانے سے پہلے ہی دولتِ ایمان سے بہرہ ور ہوگئے۔

غزوۂ بدر (۲ھ) میں کسی وجہ سے شریک نہ ہوسکے۔ کفر و حق کے اس معرکۂ اوّل میں اپنی شرکت سے محرومی کا انہیں بے حد قلق تھا، رحمتِ عالمؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوکر عرض کی "یارسول اللہؐ مجھے بہت دکھ اور افسوس ہے کہ میں آپ کے پہلے غزوہ میں آپ کی ہمرکابی کا شرف حاصل نہ کرسکا لیکن زندہ رہا تو دنیا دیکھے گی کہ آئندہ میں کیا کرتا ہوں۔

(۳)

شوال ۳ھ ہجری میں غزوۂ اُحد پیش آیا تو حضرت انسؓ بن نضر اس میں بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ

شریک ہوئے۔ جب ایک اتفاقی غلطی سے لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا اور صرف چند آدمی سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میدان میں باقی رہ گئے تو حضرت انس رضؓ بن نضر سخت بے تاب ہو کر کفار کی طرف بڑھے راستے میں حضرت سعدؓ بن معاذ ملے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا، سعد کہاں جاتے ہو، جنت وہ ہے، خدا کی قسم مجھے اُحد کی طرف سے جنت کی خوشبو آرہی ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی خبر سن کر چند صحابہ بے دلی کے عالم میں لڑائی چھوڑ کر الگ جا بیٹھے تھے، حضرت انس رضؓ بن نضر ان کے پاس سے گزرے تو پوچھا کہ تم لوگ لڑائی چھوڑ کر یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ انہوں نے کہا، افسوس کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے، حضرت انس رضؓ بولے، تو پھر تم لوگ زندہ رہ کر کیا کرو گے؟ اٹھو اور کافروں سے لڑ کر مر جاؤ جس طرح حق کی خاطر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جان دیدی یہ کہہ کر بڑھے، جوش سے تلوار چلاتے ہوئے کفار کے ہجوم میں گھس گئے اور دیر تک دادِ شجاعت دیتے رہے بالآخر مشرکین نے نرغہ کر کے ان پر تیروں تلواروں اور برچھیوں کا مینہ برسا دیا یہاں تک کہ وہ خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اگرچہ ان کا جسم زخموں سے چھلنی ہو گیا تھا لیکن کفار کی آتشِ غضب اس سے بھی نہ بجھی اور انہوں نے لاش کا مُثلہ کیا لڑائی ختم ہونے پر شہداء اور زخمیوں کی تلاش شروع ہوئی تو حضرت انس رضؓ بن نضر کی لاش پہچانی نہ جاتی تھی۔ بڑی مشکل سے ان کی بہن رُبیعؓ بنت نضر نے ان کی ایک انگلی سے لاش شناخت کی کہا جاتا ہے کہ حضرت انس رضؓ کی انگلی پر ایک تل تھا جسے دیکھ کر حضرت رُبیعؓ نے پہچانا بعض روایتوں میں یہ بھی آیا ہے کہ انہوں نے حضرت انس رضؓ کے خوبصورت دانتوں یا انگلیوں کی پوروں سے لاش شناخت کی۔ بہر صورت اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ حضرت انس رضؓ بن نضر نے راہِ حق میں اس شان سے جان دی کہ جسم کا کوئی حصہ زخموں سے خالی نہ تھا۔ خالقِ کون و مکان کو ان کی یہ ادا ایسی بھائی کہ بروایت حضرت انسؓ بن مالک خادمِ رسول اللہ یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی۔

(ایمان والوں میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جنہوں نے اللہ سے کئے
ہوئے وعدے کو سچا کر دکھایا ہے ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری
کر چکا ہے اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے)

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

نظیر صدیقی (پروفیسر علامہ اقبال یونیورسٹی، اسلام آباد)

اقبال کا تصوّرِ حیات

اگر ہم اس موضوع گفتگو کا مفہوم متعین کرلیں تو گفتگو کسی قدر آسان اور عام فہم ہوجائے گی۔ ہمارے نزدیک اقبال کے تصورِ حیات سے مراد یہ ہے کہ اقبال کی نگاہ میں انسانی زندگی کیا ہے، کیسی ہے اور اسے کس طرح بسر کرنا چاہیے۔ جب ہم اقبال کے "تصورِ حیات" پر غور کرتے ہیں تو ہماری نظر سب سے پہلے اُن کی اس چھوٹی سی نظم کی طرف جاتی ہے جس کا عنوان 'انسان' ہے اور جو اُن کے اردو کلام کے پہلے مجموعے 'بانگِ درا' میں شامل ہے۔ اقبال کی یہ نظم ہمیشہ تنقیدی توجہ سے محروم رہی ہے۔ اُن کی شاعری یا اُن کے خیالات و نظریات پر بحث کرتے وقت کبھی اس نظم کا حوالہ نہیں دیا جاتا لیکن واقعہ یہ ہے کہ اقبال کے تصورِ حیات کو سمجھنے کے لیے اس نظم کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ یہ نظم اس مصرع سے شروع ہوتی ہے ؎

قدرت کا عجیب یہ ستم ہے

اور اس نظم کے آخری دو شعر یہ ہیں ؎

لذت گیرِ وجود ہر شے — سرمستِ مئے نمود ہر شے
کوئی نہیں غمگسارِ انساں — کیا تلخ ہے روزگارِ انساں

ان اشعار کے آئینے میں زندگی کے جس تصور کا عکس ملتا ہے اس کے اعتبار سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ اقبال نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں انسانی زندگی کو ایک کربناک حقیقت کے طور پر دیکھا اور انہوں نے انسان کی کائناتی بے چارگی اور عنصری تنہائی کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ یہ اور بات ہے کہ انہوں نے انسان کی کائناتی بے چارگی اور عنصری تنہائی کو جتنی شدت کے ساتھ محسوس کیا اتنی کثرت کے ساتھ اسے اظہار میں آنے نہیں دیا۔ یہ بات اس لیے بھی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے، کہ اقبال ہر اہم موضوع پر بیسیوں طریقے سے شعر کہنے کے عادی تھے اُن کے پاس نہ الفاظ کی کمی تھی نہ اسالیب کی۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ "بانگِ درا" کی نظم "انسان" کے بعد اس موضوع

سے متعلق یہ دو شعر "بالِ جبریل" میں ملتے ہیں سو

یہ مشتِ خاک، یہ صرصر، یہ وسعتِ افلاک — کرم ہے یا کہ ستم تیری لذتِ ایجاد
تارے آوارہ و کم آمیز — تقدیرِ وجود ہے جدائی

اپنی فارسی شاعری میں بھی انہوں نے اس موضوع کو زیادہ ہاتھ نہیں لگایا "زبورِ عجم" میں ایک شعر ملتا ہے

ایں کوہ و صحرا، ایں دشت و دریا
نے رازداں، نے غم گساراں

اور یہ شعر بھی "زبورِ عجم" ہی کا ہے سو

تماشا گاہ مرگِ ناگہاں را
جہاں ماہ و انجم نام کردند

اقبال کے یہاں اس طرح کے اشعار تعداد میں یقیناً زیادہ نہیں ہیں لیکن ان اشعار میں کائنات، انسان اور انسانی زندگی کے جو تصورات ملتے ہیں وہ انتہائی تلخ حقائق کی حیثیت رکھتے ہیں اور وہ حقائق یقیناً اقبال کے فکر و احساس کی گہرائیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اتنی لمبی چوڑی کائنات میں جہاں ہزار طرح کے طوفان اٹھتے رہتے ہیں اور انسان اپنے آپ کو حیران و پریشان محسوس کرتا ہے یہ سوال اٹھانا کہ "اے خدا! تیری لذتِ ایجاد انسان کے حق میں کرم ہے یا کہ ستم" ایک عظیم سوال ہے جس پر آج کا یعنی بیسویں صدی کا انسان پہلے سے زیادہ سنجیدگی سے غور کر رہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک اجنبی اور غیر ہمدرد کائنات میں پاتا ہے جہاں اس کی طرف نہ صرف مظاہرِ فطرت اور عناصرِ قدرت کا رویہ کم آمیزی اور بے اعتنائی کا رویہ ہے بلکہ خود انسانوں میں بھی انسان کے رازدار اور غم گسار بہت کم ہوتے ہیں اور نتیجتاً انسان اپنے ہم جنسوں کے معاملے میں بھی دوری اور علیحدگی کے احساس کا شکار رہتا ہے اس سے بھی بڑا المیہ یہ ہے کہ انسان کو جس دنیا میں رہنا پڑتا ہے وہ ماہ و انجم کی دنیا کہلاتی ہے لیکن حقیقت میں وہ مرگِ ناگہاں کی تماشا گاہ ہے جہاں ہر لمحہ بے شمار انسان مرگِ ناگہاں کے شکار ہوتے رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ تماشا گاہ بھی عجیب ہے کہ ہر انسان دوسروں کی موت کا تماشا دیکھتے دیکھتے خود موت کا تماشا بن جاتا ہے۔

تماشا گاہ مرگِ ناگہاں را
جہاں ماہ و انجم نام کردند

اگرچہ اقبال نے اس شعر میں بڑے نرم اور خوبصورت الفاظ استعمال کئے ہیں پھر بھی یہ شعر اس بھیانک منظر کو

آنکھوں کے سامنے کھینچ لاتا ہے جس کی تصویر فرانس کے عظیم مفکر پاسکل نے ان لفظوں میں پیش کی ہے۔

"یہ تصور کرو کہ بہت سے لوگ پابہ زنجیر ہیں۔ اُن سب کو موت کی سزا سنائی جا چکی ہے۔ ان میں سے کچھ لوگوں کو ہر روز دوسروں کے سامنے ذبح کر دیا جاتا ہے۔ جو بچ رہتے ہیں وہ اپنی حالت کو ساتھیوں کی حالت کی روشنی میں دیکھتے ہیں اور رنج و مایوسی کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں۔"

انسانی زندگی اور انسانی کائنات کے اس الم ناک تصور کا نتیجہ تو یہی ہونا چاہیئے تھا کہ اقبال انسانی زندگی اور انسانی تقدیر کے نوحہ خواں ہوتے ہیں لیکن ان کی شاعری کا مجموعی تاثر بالکل اس کے برعکس ہے۔ اقبال انسانی زندگی اور انسانی تقدیر کے نغمہ خوانوں میں سے ہیں اور جیسی نغمہ خوانی انہوں نے کی ہے اس کی مثال دوسروں کے یہاں نہیں ملتی خصوصاً بیسویں صدی کے عالمی ادب میں نہیں ملتی۔ کولن ولسن کو بیسویں صدی کے سارے مغربی ادب کا انسان شکست خوردہ، مفلوج اور قنوطیت زدہ نظر آتا ہے کیونکہ اُس کی تشخیص کے مطابق آج کا انسان اُس مرض میں مبتلا ہے جسے وہ بے اہمیتی کا مغالطہ یعنی FALLACY OF INSIGNIFICANCE کہتا ہے۔

اقبال کی شاعری کے بیشتر حصے میں انسان نہ تو اپنی بے اہمیتی کے مغالطے میں مبتلا ہے نہ وہ شکست خوردہ مفلوج اور قنوطیت زدہ ہے۔ چونکہ اقبال کے بنیادی خیالات و افکار کا سرچشمہ قرآنی تعلیمات اور اسلامی نظریات ہیں اس لئے اقبال کے یہاں انسان کو اس کائنات میں ایک مرکزی مقام حاصل ہے۔ چونکہ انسان اس دنیا میں خدا کا قائم مقام اور نائب مناسب ہے اس بنا پر وہ خدا کے بعد کائنات کی عظیم ترین ہستی کی حیثیت رکھتا ہے۔ مذہب اسلام اور تصوف اسلام دونوں انسان کی مرکزی حیثیت اور اس کی عظمت کی تصدیق و توثیق کرتے رہے ہیں۔ چونکہ اقبال کے دل و دماغ مذہب اسلام اور تصوف اسلام دونوں سے سیراب و فیض یاب ہوئے تھے اس لئے ان کی شاعری اور ان کے نظام فکر دونوں میں انسان کی اہمیت اور عظمت پر وہ اصرار ملتا ہے جس کی مثال عالمی تمامت کے دوسرے مفکروں اور شاعروں کے یہاں بھی مشکل سے ملے گی بڑی بات یہ ہے کہ اقبال نے انسان کی عظمت کا ترانہ جس جوش و خروش کے ساتھ گایا ہے وہ صرف ایک شاعر کا جذباتی تموج نہیں بلکہ اس کے پیچھے ایک مفکر کا تفکر بھی ہے۔ اگر اقبال کائنات میں انسان کو مرکزی مقام کا مالک ظاہر کرتے ہیں؟ اور اگر اقبال انسان کے بے اندازہ

امکانات اور ناقابلِ تصور فتوحات کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو یہ باتیں ایسی ہیں جن کا تعلق انسان کی صرف تمنا سے نہیں تاریخ سے بھی ہے۔ اقبال کہتے ہیں۔

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے　　جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں　　کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

یہ اور اس طرح کے اشعار اقبال کی صرف خوش خیالی کا نتیجہ نہیں اس طرح کے اشعار میں اقبال نے انسان کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس کا تعلق انسان کی تقدیر اور تاریخ دونوں سے ہے۔ اقبال کو انسان کی کمزوریوں اور معذوریوں —— (LIMITATIONS) سے انکار نہیں لیکن وہ اس کی بے پناہ استعداد اور ناقابل تصور امکانات پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ وہ فکر کی اولیت اور اہمیت کے منکر نہیں لیکن وہ جانتے ہیں کہ انسان کی زندگی فکر سے نہیں عمل سے بنتی ہے زندگی کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اسی لئے اقبال کے تصورِ حیات میں عمل پر بہت زور ملتا ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ عمل صرف منزل تک پہنچنے کا ذریعہ نہیں بلکہ اپنی ذات اور اپنے امکانات کو سمجھنے کا وسیلہ بھی ہے۔ وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ عمل فطری صلاحیتوں کی کمی کو پورا نہیں کر سکتا لیکن یہ بھی طے ہے کہ فطری صلاحیتیں عمل کے بغیر اظہار میں نہیں آسکتیں اقبال کا فلسفۂ عمل ان کے فلسفۂ حیات کا ایک جزو ہے۔ چونکہ انسانی زندگی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بٹی ہوئی ہے اس لئے اقبال کا فلسفۂ حیات زندگی کے ان دونوں پہلوؤں پر مشتمل ہے۔ یوں تو اقبال کے فلسفۂ حیات کی وضاحت کے لئے خاصا وقت چاہیئے لیکن مختصراً اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ان کے نزدیک فرد کا فرض یہ ہے کہ سب سے پہلے وہ اپنی صلاحیتوں کی سمت کو دریافت کرے۔ اس کے بعد جب وہ اپنی صلاحیتوں کی تربیت مکمل کرے تو انہیں صرف اپنی ذات اور اپنے مفادات کے لئے استعمال نہ کرے بلکہ انہیں اپنی جماعت، اپنی قوم اور وسیع تر انسانیت کے لئے صرف کرے، اقبال نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ فرد اور جماعت دونوں کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ دونوں کے سامنے بلند سے بلند نصب العین ہونے چاہئیں نصب العین کے حصول کا انحصار عمل پر ہے اور عمل ہی وہ چیز ہے جس کی مدد سے انسان کی زندگی جبر کے حدود سے نکل کر اختیار کے حدود میں آتی ہے اور اس کے اختیار کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے تو یہ ہے اقبال کے تصورِ حیات کا خاکہ۔

بقیہ تبصرہ کتب

۹:- آغوشِ حیرت (رباعیات) نصیر الدین نصیر
۱۰:- ماجرا —— محسن بھوپالی
۱۱ فقہ القرآن حصہ اول —— مولانا عمر احمد عثمانی
۱۲ " " حصہ دوم —— مولانا عمر احمد عثمانی
۱۳ " " حصہ سوم —— مولانا عمر احمد عثمانی
۱۴:- میری نئی بیاض —— راسخ عرفانی
۱۵:- قرآن سے قرآن تک ، عرشی مکتبہ معارف قرآن
۱۶:- رسوا کیا مجھے - علامہ حکیم محمد حسین عرشی امرتسری
۱۷:- رجم —— مولانا عمر احمد عثمانی

ڈاکٹر عبدالستار دلوی
جوائنٹ سکریٹری، مہاراشٹر اردو اکیڈمی، بمبئی

اقبال اور بمبئی

شہر بمبئی کو ہندوستان کے دیگر شہروں کے مقابلہ میں گزشتہ تقریباً دو سو سال سے ایک امتیازی حیثیت حاصل رہی ہے۔ ابتداء میں اس کی اس اہمیت کی وجہ اس کا جغرافیائی محل وقوع تھا جسے بعد میں اس کی صنعتی اور تجارتی حیثیت نے اور جلا دی۔ اسے ہندوستان کا دروازہ بھی کہا گیا کہ اسی کے راستہ سے ہندوستان نے اپنے تعلقات کو بیرونی ممالک کے ساتھ وسعت دی۔ امپریل گزیٹیر کی صراحت کے مطابق اپنے قدرتی حسن اور مناظر اور تجارتی فوائد اور اہمیت کی وجہ سے مشرق کا کوئی بھی شہر اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ انیسویں صدی کی ابتداء ہی سے اسے تعلیمی اور تہذیبی حیثیت بھی حاصل ہوگئی۔ ہندوستان میں انگریزی تعلیم کا سورج بھی یہیں سے طلوع ہوا ہے۔ اور اسی کی شعاعوں کی ضیا باریوں سے ہندوستان کا قریہ قریہ جگمگا اٹھا، انگریزی تعلیم کے ساتھ ایک نئے ذہن کی پرورش اور پرداخت شروع ہوئی اور ایک نیا ہندوستانی ذہن بنا جس نے نئے علوم کی مدد سے اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کی اور اپنے کو جہاں بانی کے لئے تیار کیا۔

بمبئی کی علمی اور تہذیبی حیثیت سے اردو کے دانشور، ادیب اور شاعر ابتداء ہی سے متاثر ہیں۔ چنانچہ مولانا محمد حسین آزاد فارسی زبان کے علمی مطالعہ کے لئے ژند اور اوستا پہلوی کے علمی خزانوں کی تلاش میں یہیں پارسیوں کے مذہبی پیشواؤں سے ملے اور سخندانِ فارس کی بلند علمی عمارت تعمیر کی۔ شیفتہ بھی یہاں کی تہذیبی زندگی اور رہن سہن سے متاثر ہوئے۔ شیفتہ ۱۸۳۹ء میں حجاز جاتے ہوئے بمبئی تشریف لائے تھے۔ اپنے سفر بمبئی کے بارے میں وہ لکھتے ہیں۔

"۱۲؍ ربیع الثانی ۱۲۵۵ھ (مطابق ۷؍ مئی ۱۸۳۹ء) کو گوگر بندر (گھوگا بندر) قیام کیا۔

اور ۱۴؍ ربیع الثانی کو دوپہر کے وقت مہائم پہنچے۔ بمبئی مہائم سے تین کوس ہے مہائم باب بمبئی کہتے ہیں۔ قصبہ میں مصنف تفسیر رحمانی کا مزار یہاں پر ہے۔ یہ بزرگ

ملتے ہیں۔ مگر میں نے ٹامس کک کی ہدایت سے انگلش ہوٹل میں قیام کیا اور تجربہ سے معلوم کیا کہ یہ ہوٹل ہندوستانی طلبہ کے لئے جو ولایت جارہے ہیں ہوں نہایت موزوں ہے۔ ریلوے اسٹیشن یہاں سے قریب ہے، انگاٹ یہاں سے قریب ہیں۔ ٹامس کک کا دفتر یہاں سے قریب ہے۔ غرض ہر قسم کا آرام ہے اور صرف تین روپیہ یومیہ اور ہر قسم کا آرام حاصل کرلو۔ یہاں کا منتظم ایک پارسی پیرمرد ہے جس کی شکل سے اس قدر تقدس ظاہر ہوتا ہے کہ دیکھنے والے کو ایران کے پرانے (بنی) یاد آجاتے ہیں دوکانداری نے اس کو ایسا عجز سکھادیا ہے کہ ہمارے بعض علماء میں باوجود عبادت اور مرشد کامل کی صحبت میں بیٹھنے کے بھی ویسا انکسار پیدا نہیں ہوتا۔ کارلائل نے کیا خوب کہا ہے کہ سو

"محنت ہی بہت بڑی عبادت ہے"

میرے دل پر اس پیرمرد کی صورت کچھ ایسا اثر کرتی تھی کہ بعض اوقات اسے دیکھ کر میری آنکھیں پرنم ہوجاتی تھیں۔ لیکن جب اس کی وقعت میرے دل میں اندازہ سے زیادہ ہوگئی تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا جس کا بیان بعض وجوہ سے ضروری ہے۔ میں ایک شام نیچے کی منزل میں کرسی پر بیٹھا تھا کہ پارسی پیرمرد کمرے سے باہر نکلا۔ اس کی بغل میں شراب کی ایک بوتل تھی۔ جب اس نے مجھے بیٹھے ہوئے دیکھا تو اس کو چھپانے کی کوشش کی اور میں نے دور سے تاڑ کر آواز دی کہ سیٹھ صاحب ہم سے کیوں چھپاتے ہو۔ خوشی سے اس کا شوق کرو۔ ذرا مسکرایا اور کچھ پیئے ہوئے بھی تھا، بولا۔

"شراب شوک پینے سے سبھی غم دور ہوجائے"

میں نے اس کو کہا۔ واہ رے بڈھے۔ خدا تیری عمر دراز کرے اور تیری پرانی شاخ سے میوۂ نورس پیدا ہوکر بمبئی کیمپ بازار میں بکتا پھرے۔

اس ہوٹل میں ایک یونانی بھی آکر مقیم ہوا جو ٹوٹی پھوٹی سی انگریزی بولتا تھا۔ میں نے ایک روز اس سے پوچھا۔ تم کہاں سے آئے ہو؟۔ بولا۔ چین سے آیا ہوں اب ٹرانسوال جاؤں گا۔ میں نے پوچھا چین میں تم کیا کام کرتے تھے۔ کہنے لگا۔ سوداگری کرتا تھا لیکن چینی لوگ ہماری چیزیں نہیں خریدتے۔ میں نے سوچ کر دل میں کہا کہ ہم ہندیوں سے تو یہ افیمی ہی عقلمند نکلے کہ اپنے ملک کی صنعت کا خیال رکھتے ہیں۔ شاباش افیمیو۔ شاباش! نیند سے بیدار ہوجاؤ۔ ابھی تم آنکھیں ہی مل رہے ہو کہ اس سے دیگر قوموں کو اپنی اپنی فکر پڑگئی ہے۔ ہاں ہم ہندوستانیوں سے یہ توقع نہ رکھنا کہ ایشیا کی تجارتی عظمت کو ازسرنو قائم کرنے میں تمہاری مدد کرسکیں گے۔ ہم متفق ہوکر کام کرنا نہیں جانتے ہمارے ملک میں محبت اور مروت کی بُو باقی نہیں رہی۔ ہم اس کو پکا مسلمان سمجھتے ہیں جو ہندوؤں کے خون کا پیاسا ہو اور اس کو پکا ہندو خیال کرتے ہیں جو مسلمان کی جان

کا دشمن ہو۔ ہم کتاب کے کیڑے ہیں اور مغربی دماغوں کے خیالات ہماری خوراک ہیں۔ کاش خلیج بنگال کی موجیں ہمیں غرق کر ڈالیں! مولوی صاحب میں بے اختیار ہوں لکھنے بیٹھے سفر کے حالات اور بیٹھ گیا ہوں وعظ کرنے۔ کیا کروں! اس سوال کے متعلق تاثرات کا ہجوم میرے دل میں اس قدر ہے کہ بعض اوقات مجھے مجنوں سا کر دیا اور کر رہا ہے!"

اقبال آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"ایک شب میں کھانے کے کمرے میں تھا کہ دو جنٹلمین میرے سامنے آ بیٹھے۔ شکل سے معلوم ہوتا تھا کہ یورپین ہیں فرانسیسی میں باتیں کرتے تھے۔ آخر جب کھانا کھا کر اٹھے تو ایک نے کرسی کے نیچے سے اپنی ترکی ٹوپی نکال کر پہنی جس سے مجھے معلوم ہوا کہ یہ کوئی ترک ہے۔ میری طبیعت بہت خوش ہوئی اور مجھے یہ فکر پیدا ہوئی کہ کسی طرح ان سے ملاقات ہو۔ دوسرے روز میں نے خواہ مخواہ باتیں شروع کیں۔ یورپ کی اکثر زبانیں سوائے انگریزی کے جانتا تھا۔ میں نے پوچھا۔ فارسی جانتے ہو۔ بولا بہت کم۔ پھر میں نے اس سے فارسی میں گفتگو شروع کی، لیکن وہ نہ سمجھتا تھا۔ آخر مجبوری ٹوٹی پھوٹی عربی میں اس سے باتیں کیں۔ یہ نوجوان ترک ینگ ٹرک پارٹی سے تعلق رکھتا تھا اور سلطان عبدالحمید کا سخت مخالف ہے۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ وہ شاعر بھی ہے۔ میں نے درخواست کی کہ اپنے شعر سناؤ۔ کہنے لگا کہ میں کمال بے (ترکی کا سب سے بڑا مشہور زندہ شاعر) کا شاگرد ہوں اور اکثر پولیٹکل معاملات پر لکھا کرتا ہوں۔ کمال بے کے جو اشعار اس نے سنائے سب کے سب نہایت عمدہ تھے۔ لیکن جو شعر آپ نے سنائے وہ سب کے سب سلطان کی ہجو میں تھے۔ ان میں سے ایک شعر یہاں درج کرتا ہوں۔

ظلم و جور تو سفوجہ پر ملتے مو ایلور
آذیت ملک وملت دشمن عبدالحمید

یعنی کیا ظلم و جور نے تمام قوم کو مٹا دیا ہے۔ عبدالحمید آذیت اور ملک و قوم سب کا دشمن ہے۔

اسی مضمون پر اس سے بہت گفتگو ہوئی اور میں نے اسے بتایا کہ ینگ پارٹی کو انگلستان کی تاریخ سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ کیونکہ جس طریق سے رعایا انگلستان نے بتدریج اپنے بادشاہوں سے پولیٹکل حقوق حاصل کئے ہیں وہ طریق سب سے عمدہ ہیں۔ بڑے بڑے عظیم الشان انقلابوں کا بغیر کشت وخون کے ہو جانا یہ سب کچھ انگلستان ہی کا حصہ ہے۔ ایک روز سر شام میں اور یہ ترک جنٹلمین بمبئی کا اسلامیہ مدرسہ دیکھنے چلے گئے۔ وہاں اسکول کے گراؤنڈ میں مسلمان طلبہ کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ہم نے ان میں سے ایک کو بلایا اور اسکول کے متعلق بہت سی باتیں ان سے دریافت کیں۔ میں نے اس طالب علم سے پوچھا کہ انجمن اس اسکول کو کالج کیوں نہیں بنا دیتی، کیا فنڈ نہیں ہے یا اور کوئی وجہ ہے۔ اس نے جواب دیا کہ فنڈ تو موجود ہے اور اگر ضرورت ہو تو

ایک آن میں موجود ہو سکتا ہے کیونکہ خدا کے فضل سے یہاں پر بڑے بڑے متمول مسلمان سوداگر موجود ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ مسلمان طلبہ پڑھنے لکھنے کے لئے نہیں آتے اس کے علاوہ اور اچھے اچھے کالج بمبئی میں موجود ہیں۔ اور جیسی تعلیم ان میں ہوتی ہے ویسی سردست ہم یہاں ویسے ہی نہیں سکتے یہ جواب سن کر میں بہت خوش ہوا۔ میرا خیال تھا کہ بمبئی جیسے شہر میں مسلمانوں کا کالج ضرور ہوگا کیونکہ یہاں کے مسلمان تمول میں کسی اور قوم سے پیچھے نہیں ہیں۔ لیکن یہاں آکر معلوم ہوا کہ تمول کے ساتھ ان میں عقل بھی ہے۔ ہم پنجابیوں کی طرح احمق نہیں ہیں۔ ہر چیز کو تجارتی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور نفع و نقصان پر ہر پہلو سے غور کر لیتے ہیں۔

غرض کہ بمبئی (خدا اسے آباد رکھے) عجیب شہر ہے۔ بازار کشادہ، ہر طرف پختہ سر بفلک عمارتیں ہیں کہ دیکھنے والے کی نگاہ ان سے خیرہ ہوتی ہے۔ بازاروں میں گاڑیوں کی آمد و رفت اس قدر ہے کہ پیدل چلنا محال ہو جاتا ہے۔ یہاں ہر چیز مل سکتی ہے، امریکہ کے کارخانوں کی کوئی چیز طلب کرو فوراً ملے گی۔ ہاں البتہ ایک چیز ایسی ہے جو اس شہر میں نہیں مل سکتی یعنی فراغت۔

یہاں پارسیوں کی آبادی اسّی، نوّے ہزار کے قریب ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام شہر پارسیوں کا ہے۔ اس قوم کی صلاحیت نہایت قابلِ تعریف ہے اور ان کی دولت و ثروت بے اندازہ۔ مگر اس قوم کے لئے اچھے فیوچر FUTURE کی پیشن گوئی نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ عام طور پر سب کے سب دولت کمانے کی فکر میں ہیں اور کسی چیز پر اقتصادی پہلو کے سوا کسی اور پہلو سے نگاہ ہی نہیں ڈال سکتے۔ علاوہ اس کے نہ کوئی ان کی زبان ہے نہ ان کا لٹریچر ہے اور طرہ یہ ہے کہ فارسی کو نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ افسوس! یہ لوگ فارسی لٹریچر سے غافل ہیں ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ ایرانی لٹریچر میں عربیت کو فی الحقیقت کوئی دخل نہیں بلکہ زردشتی رنگ اس کے رگ و ریشے میں ہے اور اس پر اس کے حسن کا دار و مدار ہے۔ میں نے اسکول کے پارسی لڑکے اور لڑکیوں کو بازار میں پھرتے دیکھا۔ چستی کی مورتیں تھیں۔ مگر تعجب ہے کہ ان کی خوبصورت آنکھیں اسّی فیصدی کے حساب سے عینک پوش تھیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ عینک پوشی پارسیوں کا قومی فیشن ہوتا جاتا ہے۔ معلوم نہیں کہ ان کے قومی ریفارمر اس طرف توجہ کیوں نہیں دیتے۔ اس شہر کی تعلیمی حالت عام طور پر نہایت عمدہ معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے ہوٹل کا حجام ہندوستان کی تاریخ کے بڑے بڑے واقعات جانتا ہے۔ گجراتی کا اخبار ہر روز پڑھتا تھا۔ اور جاپان اور روس کی لڑائی سے پورا باخبر تھا۔ نوروجی دادا بھائی کا نام بڑی عزت سے لیتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ نوروجی انگلستان میں کیا کرتا ہے؟

بولا۔ "ہم غریب کالوں کے لئے لڑتا ہے۔"

صحبت رہی۔ سردار موصوف فارسی اور عربی ادبیات پر پورا عبور رکھتے ہیں۔ عرب کی جدید شاعری سے بھی باخبر ہیں۔ فارسی میں خاقانی کے بڑے معترف ہیں۔ علوم دینی میں بھی کافی دسترس رکھتے ہیں۔ ہرات کے قاضی رہ چکے ہیں۔ ان کے دولت کدہ پر مرزا طلعت یزدی نے جو بمبئی میں دس سال سے مقیم ہیں۔ ایرانی لہجے میں اشعار سنائے ——— اسی شام عطیہ بیگم صاحبہ کے یہاں سماع کی صحبت رہی، جہاں ابل برس بار نہ پاسکے۔ ۱۲ ستمبر کو ایک بجے کے قریب بمبئی سے روانہ ہوئے"

دوسری بار گول میز کانفرنس کے لئے بمبئی سے روانگی سے قبل اقبال نے بمبئی کرانیکل کے خصوصی نمائندہ کو ایک انٹرویو دیا جس میں انہوں نے غیر مسلم، پین اسلامزم، امپیریلزم، بالشوزم، قومیت کے نظریے، عرب ممالک کے وفاق وغیرہ مختلف موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ———

اقبال نے عطیہ بیگم کے ہاں جس محفل سماع کا ذکر کیا ہے۔ اس محفل میں جناب ضیاء الدین احمد برنی بھی موجود تھے۔ انہوں نے اس محفل کے سجانے میں عطیہ بیگم کا ہاتھ بٹایا۔ اور اس بزم کے واقعات کو چشم دید گواہ کی حیثیت سے محفوظ کیا ہے۔

جناب برنی ڈاکٹر اقبال سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ———

"ڈاکٹر اقبال سے میری ملاقات بمبئی میں ستمبر ۱۹۳۱ء میں ہوئی۔ جب کہ وہ دوسری گول میز کانفرنس سے واپس ہوئے تھے اور خلافت ہاؤس میں مقیم تھے۔ انہیں دنوں ایک سہ پہر کو محترمہ عطیہ بیگم نے اپنے دولت کدہ "ایوان رفعت" میں انہیں چائے پر مدعو کیا۔ اس موقع پر ہائی کورٹ کے جج مرزا علی اکبر خان، مولانا محمد عرفان، ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی اور بہت سے اکابر و فضلاء موجود تھے۔

بقول ضیاء الدین برنی ———

"یہ ٹی۔ پارٹی لان میں دی گئی تھی جس میں پھولوں کی پر بہار روشوں اور سمندری ماحول کی وجہ سے ایک خاص دلآویزی پیدا ہو گئی تھی۔"

برنی لکھتے ہیں کہ ———

"اس وقت عطیہ بیگم کی مدد کرنے کے خیال سے "ایوان رفعت" بہت پہلے پہنچ گئے تھے۔ اتفاق یہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کو پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ بیگم صاحبہ بہت گھبرائی ہوئی تھیں۔ اور اسی حالت میں مجھ سے فرمایا کہ "موٹر لے کر جاؤ اور ڈاکٹر صاحب کو لاؤ" ——— ابھی چند فرلانگ گیا ہوں گا کہ دیکھا ڈاکٹر صاحب اور مولانا عرفان چلے آرہے ہیں۔ میں ان کی گاڑی میں بیٹھ گیا اور عرض کیا کہ "آپ کا وہاں بڑی شدت سے انتظار کیا جا رہا ہے"۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ "میں آج عطیہ بیگم کو ذرا ستانا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا کہ "یہ کام تو آپ پھر بھی کر سکتے ہیں لیکن آپ کے انتظار میں جو اکابر جمع ہیں انہیں آپ کس مد میں ستا رہے ہیں؟"

بہرحال ڈاکٹر صاحب چلنے پر رضامند ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں ہم "ایوانِ رفعت" پہنچ گئے جہاں دروازے پر بیگم صاحبہ اور فیضی رحمین نے ان کا استقبال کیا۔ بیگم صاحبہ کے شکوہ شکایت کے بعد ہم سب لان میں پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب کو جتنا مسرور میں نے اس سہ پہر کو دیکھا۔ اتنا کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ عطیہ بیگم سے ہنس ہنس کر مختلف موضوعات پر گفتگو کر رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ مذاقیہ جملے بھی کستے جاتے تھے۔ مجھے ایک جملہ یاد رہ گیا ہے۔ دوران گفتگو عطیہ بیگم نے کہا کہ — "اقبال یاد رکھو، بچہ کے لئے ماں کی گود سب سے بڑی تربیت گاہ ہے" اس پر ڈاکٹر صاحب نے ہنس کر پوچھا۔ "اور بیوی کی گود کے بارے میں کیا ارشاد ہوتا ہے؟" عطیہ بیگم نے جھڑک کر انہیں خاموش کر دیا۔

ضیاء الدین برنی اس بزم بے تکلف کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"چائے نوشی سے فارغ ہوتے ہی بیگم صاحبہ نے معزز مہمان کا تعارف کرایا۔ اور ان سے درخواست کی کہ وہ کچھ پیغام دیں۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کھڑے ہوئے اور مختصر سی تقریر کی اور ساتھ ہی اپنا ایک شعر سنایا اور فرمایا کہ یہی میرا پیغام ہے۔ وہ شعر یہ ہے —

چناں بزی کہ اگر مرگ تست مرگ دوام
خدا ز کردۂ خود شرمسار می گردد....

* LIVE SO BEAUTIFULLY
THAT IF DEATH IS THE END OF ALL,
GOD HIMSELF MAY BE PUT TO SHAME
FOR HAVING ENDED THY CAREER."

"ایوانِ رفعت" کی اس محفل سے متعلق برنی صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں —

"لان سے سب حاضرین کو ہال میں لے جایا گیا۔ جہاں رقص و سرود کا انتظام تھا میں ڈاکٹر صاحب کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر تک موسیقی ہوتی رہی اور اس کے بعد رقص ہوا۔ ایک کالی کلوٹی بنگالی لڑکی نے اپنا کمال دکھایا۔ رقص کے دوران میں ڈاکٹر صاحب نے ایک کاغذ طلب کیا اور ذیل کے

اشعار لکھ کر انہیں عطیہ بیگم کی خدمت میں پیش کیا۔

ترسم کہ تو می رانی بہ سراب اندر
زاری بہ حجاب اندر میری بہ حجاب اندر
برکشت و بیاباں ریخ برکوہ و بیاباں ریخ
برقے کہ بہ خود پیچد میرد بہ سحاب اندر
ایں صوت دل آویزے از غرۂ مطرب نیست
مہجور جناں حورے نالد بہ رباب اندر

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر صاحب نے ذیل کا مزاحیہ شعر ایک کاغذ پر لکھ کر عطیہ بیگم کو دیا۔

پرائیوٹ

عالم جوش جنوں میں ہے روا کیا کیا کچھ
کہئے کیا حکم ہے دیوانہ بنوں یا نہ بنوں

محمد اقبال بمبئی ۱۰ ستمبر ۳۱ء

تقریب کے بعد ڈاکٹر صاحب نے معزز مہمانوں سے ہاتھ ملائے اور "ایوان رفعت" سے رخصت ہو گئے۔

چوتھی بار ۱۹۳۱ء ہی میں جب اقبال لندن سے ہندوستان لوٹے تو ۲۸ دسمبر کے دن صرف ایک روز کے لئے انہوں نے بمبئی میں قیام فرمایا۔ اس مرتبہ انہوں نے "خلافت ہاؤس" میں آرام کیا اور شام کو "ایوان رفعت" میں عطیہ فیضی سے نصف گھنٹے کی ملاقات کی۔

آخری مرتبہ اقبال ۱۹۳۲ء میں تیسری گول میز کانفرنس میں جاتے ہوئے بمبئی تشریف لائے اس وقت ان کا قیام اپنے دیرینہ دوست صلاح الدین سلجوقی کے ہاں تھا جو ہندوستان میں افغانستان کے سفیر تھے۔ اور جنہوں نے اقبال کی وفات کے بعد حکومت افغانستان سے تعویذ اور لوح مزار حاصل کیا جو دنیا کے سب سے قیمتی پتھر (LAPIS LAZULI) پر ہے۔ تیسری گول میز کانفرنس سے واپسی پر اقبال یورپ کی سیاحت کو گئے اور اسپین کا بھی سفر کیا۔ اس سفر سے واپسی پر اقبال فروری ۱۹۳۳ء میں پھر بمبئی آئے۔ اس مرتبہ جو غالباً علامہ اقبال کا آخری سفر بمبئی تھا۔ انہوں نے اس زمانہ کی بمبئی کے معروف اردو روزنامہ "خلافت" کے نامہ نگار کو بھی ایک انٹرویو دیا۔ اور اسپین سے متعلق اپنے تاثرات بیان کئے ہیں اس طرح جو معلومات دستیاب ہوئی ہیں ان کے مطابق اقبال کل چھ بار بمبئی تشریف لائے ہیں۔ جن میں سے ۱۹۰۵ء اور ۱۹۳۱ء میں بمبئی میں اقبال کی آمد

سے متعلق کچھ تفصیلات ملتی ہیں۔ اگر اس زمانہ کے اخبارات میسر آئیں تو ممکن ہے بمبئی میں اقبال کے قیام، تعلقات اور جلسوں اور علمی محفلوں سے متعلق زیادہ معلومات فراہم ہو سکیں اور اس طرح اقبال کی سوانح عمری میں اضافہ ہو۔

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء میں اقبال کی وفات کی خبر جب سارے ملک میں پھیلی تو اقبال کی عظیم شاعرانہ اور فلسفیانہ شخصیت اور ہندوستان گیر مقبولیت کے پیش نظر بمبئی کے آل انڈیا ریڈیو کی دعوت پر جو اس زمانے میں بیلارڈ سٹیٹ میں واقع تھا، پروگرام ڈائرکٹر جناب بی۔سی مرڈھیکر (مشہور مراٹھی شاعر) کی دعوت پر بمبئی کی مشہور علمی شخصیت اور بلند پایہ مورخ ڈاکٹر بی۔ایم۔جوشی نے اقبال کو بمبئی کے آل انڈیا ریڈیو سے خراج عقیدت پیش کیا۔ بقول ڈاکٹر جوشی

"چونکہ وہ لندن میں اقبال سرکل کے ممبر رہ چکے تھے۔ انہوں نے آل انڈیا ریڈیو کی دعوت فوراً قبول کر لی اور اپنی تقریر میں ترانہ ہندی کے علاوہ اقبال کی جس نظم کو خاص طور پر پیش کیا وہ "نیا شوالہ" تھی۔ جو اقبال کے حب الوطنی کے نادر و یادگار جذبات کی یادگار ہے۔ اور جو آج بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ وہ اقبال کے دور میں اہم تھی۔"

تلوک چند محروم — مرسلہ جگن ناتھ آزاد

رباعیات محروم

(خاص برائے فاران)

تلوک چند محروم کو اقبال سے جو نسبت خاص ہے وہ محتاج وضاحت نہیں، اُن کے لائق اور نامور بیٹے جگن ناتھ آزاد، ہندو پاکستان ہر دو اقالیم میں اپنی سلامت روی، شائستہ نگاری اور اقبال شناسی کے باعث یکساں مقبول و معروف ہیں، ماہر القادریؒ سے اُن کو ربط خاص تھا اسی رعایت سے فاران اور مدیر فاران پسران کے لطف کی ارزانیاں روزافزوں ہیں، محروم کی یہ رباعیاں انہیں تمام تعلقات کی مناسبت سے اس شمارے میں جو اقبال سے منسوب ہے، شامل کی جا رہی ہیں ——— تسنیم مینائی

اعمال کا اپنے ہو محاسب انساں
نفس امارہ پر ہو غالب انساں
ہو دشمن رحم خود تو پھر کس مُنہ سے
اللہ سے رحم کا ہو طالب انساں

بہبودِ معاد کی بات کریں...
تا وقتِ وداعِ جاں نہ ہیہات کریں
خدشہ ہے نفسِ دوں کا، لیکن کب تک؟
جب تک خود اس کی ہم مدارات کریں

ہلکی سی پھوار اور کنار دریا
یا صبح بہار اور کنار دریا
قسمت سے ملتے ہیں کسی کو محروم
ساون، اشجار اور کنار دریا

کب کوئی جہاں میں چھوٹتا ہے غم سے
دل آخر کار ٹوٹتا ہے غم سے
صدمات سے کھلتی ہیں بشر کی آنکھیں
پھوڑا غفلت کا پھوٹتا ہے غم سے

بے دل آفاتِ زندگانی سے ہوں
بیزار ترے لئے جدائی سے ہوں
احساس اس میں ترا نہیں ہے اے موت
زندہ ہوں تو اپنی سخت جانی سے ہوں

درکار جگر تھا زخم کاری کے لئے
تیار نہ تھا جگر فگاری کے لئے
مرحوم! خوش اس کو کس طرح میں رکھتا
جو عمر ملی تھی سوگواری کے لئے

دُنیا کتنی حسیں نظر آتی ہے
رنگیں، حسن آفریں نظر آتی ہے
اب یاس کی تیرگی ہے غالب ہر سُو
پہلے جو کہیں، کہیں نظر آتی تھی

ڈاکٹر محمد ایوب قادری

علامہ اقبال کا سفرِ دہلی ۱۹۰۵ء

لندن روانگی کے موقع پر

جب اقبال اعلیٰ تعلیم کے لئے عازم یورپ ہوئے تو پہلے دہلی پہنچے حضرت شیخ المشائخ نظام الدین اولیاءؒ کے مزار اقدس پر حاضری دی۔ مرزا غالب کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔ دہلی سے بمبئی پہنچے اور بمبئی سے لندن کی راہ لی۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مزار کی حاضری کی دلچسپ روداد خواجہ حسن نظامی نے اخبار "وکیل" امرتسر میں "ہمارا پردیسی" کے عنوان سے شائع کرائی جسکو مولوی انشاء اللہ ایڈیٹر "وطن" لاہور نے نقل کیا ہے۔ حضرت علامہ کی اسی حاضری کے اپنے تاثرات کو علامہ اقبال نے "پرانی یادیں" کے عنوان سے "منادی" دہلی میں شائع کیا ہے۔ خوش قسمتی سے ہمیں یہ دونوں تحریریں اور اسی سلسلہ کی ایک اور تحریر مل گئی ہے۔ ان تحریروں کو یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

علامہ اقبال کی لندن روانگی کی اطلاع ایڈیٹر "وطن" نے مندرجہ ذیل الفاظ میں شائع کی۔

"شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔ اے انگریزی علم ادب کی تکمیل کے لئے تین سال کے واسطے یکم ستمبر کو لاہور سے انگلستان کو روانہ ہو گئے۔ دعا ہے کہ خداوند کریم ان کو بخیریت و کامیابی واپس لائے۔"

اس کے بعد خواجہ حسن نظامی کی روداد ملاحظہ فرمایئے جس کو ایڈیٹر "وطن" لاہور نے وکیل امرتسر سے نقل کیا ہے "ہمارا پردیسی" کے عنوان سے حسن نظامی بمعر "وکیل" کو لکھتے ہیں۔

"ہونہار لائق و فائق ہندوستانی شیخ محمد اقبال ایم۔ اے ۳ ستمبر کو لندن سدھارا۔ خدا اُسے بامراد واپس لائے اور غریب ہندوستان کو اس کی ذات سے فائدہ حاصل کرنے کا موقع دے۔[1]

---

[1] وطن لاہور مجریہ ۸ ستمبر ۱۹۰۵ء بروز جمعہ مطابق ۷ رجب ۱۳۲۳ھ موافق ۲۴ بھادوں سمت ۱۹۶۲ جلد نمبر ۵ شمارہ نمبر ۳۵ ص ۸ کالم ۱

۲؍ستمبر کو صبح ۸ بجے دہلی اسٹیشن پر ہندی اقبال کا خیر مقدم کیا گیا۔ یہ درویش بھی اپنے ہمراز مسافر کے استقبال کے لئے حاضر تھا۔ چونکہ دہلی میں محض حضرت محبوب الٰہی کے مزار کی زیارت کے لئے قیام کیا گیا تھا اس لئے کچھ دیر اپنے محب خاص مولوی نذر محمد بی۔ اے اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس حلقہ دہلی کے مکان پر توقف کرکے درگاہ شریف کی جانب روانہ ہوگئے۔ اگرچہ کھانے کا وقت آگیا تھا اور مولوی نذر محمد صاحب کی آرزو تھی کہ یہ قافلہ شکم سیری کے بعد کوچ کرے مگر اقبال نے لنگر محبوب کی سوکھی روٹیوں کو پُر تکلف طعام پر ترجیح دی اور کوچ کا سامان کردیا۔

الغرض رمز شناس حقیقت میر نیرنگ ساکن انبالہ، شیخ محمد اکرم نائب ایڈیٹر مخزن لاہور، مولوی نذر محمد، منشی نورالدین ڈرائنگ ماسٹر نارمل اسکول دہلی، حسن نظامی، اقبال وغیرہ کی جماعت دربار سلطانی میں حاضر ہوئی۔ ہم سب لوگ تو زیارت کرکے روضۂ مبارک کے باہر آگئے اور اقبال نے عین مزار شریف کے متصل کچھ دیر مراقبہ کیا اور اپنی نئی نظم "خاموشی کی صدائیں" پیش کی۔ اس کے بعد روضۂ مقدس کے سرہانے لوگوں کے حلقہ میں بلند آواز اور اقبالی لحن میں اس نظم کو دوبارہ سنایا۔ اس وقت سامعین پر ایک خاص کیفیت طاری تھی۔ یہ نظم اقبال کی تمام نظموں میں ممتاز اور مخصوص سمجھی جانے کے قابل ہے۔ اس کا ایک حصہ حضرت محبوب الٰہی کی منقبت میں تھا، اور ایک حصے میں اپنے سفر کی غرض وغایت بیان کی تھی۔ اور یہ بھی ظاہر کیا تھا کہ وہ آئندہ کس قسم کی زندگی اختیار کرنا چاہتے ہیں یہ نظم غالباً اکتوبر کے مہینے میں مخزن کے ذریعہ سے شائع ہوگی۔ (مخزن لاہور سے نکلتا ہے اور ہندوستان میں اردو زبان کا سب سے عمدہ ماہواری رسالہ تسلیم کیا جاتا ہے) میرے خیال میں یہ نظم اس قابل ہے کہ ہندوستان کا ہر اردو خواں باشندہ اس کو پڑھے اور نتائج پر غور کرے۔

زیارت سے فارغ ہوکر وہ خشک روٹی جو توشہ خانہ حضرت محبوب الٰہی کی جانب سے فقراء اور درویشوں کو دی جاتی ہے ان سب گرجویٹ درویشوں نے خوشی خوشی مزے سے کھائی پھر روحانی شراب یعنی سماع کا دور چلتا رہا اور ولایت خاں قوال نے خوب رنگ جمایا۔ اس قوال کو بھی حضرت محبوب الٰہی سے خاص واسطہ ہے۔ کیونکہ یہ حضرت سامتؒ کی اولاد میں ہے جو حضرت محبوبؒ الٰہی کے خاص اور پسندیدہ قوال تھے۔ اب ان کی اولاد میں صرف ایک ہی گھر باقی رہ گیا ہے۔

قصہ مختصر چند ساعت کی چہل پہل کے بعد رخصت اور وداع کی تیاریاں ہونے لگیں۔ چلتے چلتے مرزا غالب کے مزار پر بھی گزر ہوگیا اور ایک ایسا نظارہ دیکھا، جو وفاتِ غالب سے لے کر آج تک کسی نے نہ دیکھا ہوگا۔ جب ہم قبرستان کے احاطہ میں داخل ہوئے سورج ڈھل چکا تھا۔ شاید ایک بجا ہوگا۔ دھوپ میں ناقابل برداشت تیزی تھی۔ اول چند مغل امراء کی قبروں کو پامال کرنا پڑا، جو مرقد غالب کے رستہ میں حائل تھیں۔ اس کے بعد ہم خاک کے اس ڈھیر پر پہنچ گئے جس کے نیچے

گنج معانی دفن ہے۔ مرزا غالب کا آدھا چبوترہ مٹی میں پوشیدہ تھا۔ ہم اسی رخ ایک کچی دیوار کا تکیہ لگا کر بیٹھ گئے یہ چھوٹی سی دیوار غالب کے دائیں پہلو میں اداس اور چپ چاپ کھڑی تھی۔ اس نے باوجود بے سروسامانی ہم پر سایہ ڈالا اور سونے والے غالب کی طرف سے میزبانی کی، نیرنگ و اقبال پر اس سین کا اتنا اثر تھا کہ افسردگی کے عالم میں خاموش سر جھکائے بیٹھے تھے ویسی ہی، اکرام، نذر محمد، نورالدین، حسن نظامی کی حالت تھی اور مزار کے گرد حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ یکایک ولایت کی سریلی ورمبین آواز میں غالب کی روح بولنے لگی۔ جس وقت ولایت نے غالب کا یہ شعر پڑھا۔

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھئے بس اب کہ لذت خواب سحر ہو گئی

سب پر از خود رفتگی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ خاص کر اقبال جھوم جھوم کر شعر کی تکرار کرتے تھے۔ اس پر عسرت و پرحسرت سین کا بہت جلد خاتمہ ہو گیا اور ہم غالب کو اکیلا چھوڑ کر چلے آئے۔ شب مولوی نذر محمد بی اے کے مکان پر بسر ہوئی۔ جو نہایت خلیق و متواضع آدمی ہیں۔ صبح ۶ بجے بمبئی میل میں ہمارا پردیسی تین برس کے لئے ہم سے چھوٹ گیا۔" [۱]

اب حضرت ملا واحدی کے تاثرات ملاحظہ کیجئے:۔

۱۹۰۵ء کا ایک یادگار دن

جب اقبال حضرت سلطان المشائخ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھئے بس اب کہ لذت خواب سحر ہو گئی

مرزا غالب یہ کس کی سرمستیوں کا ذکر کر رہے ہیں۔ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کس پر چھائی تھیں اور پھر کس کا نشہ اترا تھا۔ کس کی جوانی ڈھلی تھی اور کس کا لطف حیات گیا تھا۔ ان کا اپنا ذکر ہو یا کسی اور کا، ذرا غور تو کیجئے۔ جس کا بھی ذکر ہے وہ آج لذتِ خواب سحر ہی سے نہیں۔ لذت خواب زندگی سے بھی محروم ہے۔ مرزا کو لذت خواب سحر جانے کا ملال تھا وہاں لذت خواب زندگی بھی نہیں رہی۔

ڈیڑھ سو برس قبل یہی سب کچھ ہوتا ہوگا جو آج کل ہوتا ہے اور ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ لیکن بقول میر نیرنگ، زمانے

---

[۱] وطن لاہور یوم ۴ ۲۲ دسمبر ۱۹۰۵ء مطابق ۲۲ رجب المرجب ۱۳۲۳ھ جلد ۵ نمبر ۲۷

کی تبلیغ اس طرح چلتی ہے کہ کترنیں تک کہیں پڑی نہیں چھوڑتی۔ پرانی باتیں جانے دیجئے۔ کل کی بات لیجئے۔ میرے سامنے کی بات ہے لیکن یہ بھی داستان پارینہ ہے۔ اقبال ابھی شیخ محمد اقبال ایم۔ اے ہیں اور بیرسٹری کی تعلیم اور فلسفے کی تکمیل کے لئے یورپ روانہ ہو رہے ہیں۔ ویسے اقبال کا نام اور کلام گھر گھر میں گونج رہا ہے۔ ان کی نظمیں ملک کے متعدد رسالوں میں چھپتی ہیں اور داخل نصاب ہیں۔ ان کا یہ شعر بچے بچے کی زبان پر ہے۔

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ
وہ جھاڑیاں چمن کی، وہ میرا آشیانہ

ادبی اور علمی دنیا میں لاہور کے تین نوجوانوں کے تعلق چرچا تھا کہ پنجاب کو چار چاند لگائیں گے۔ ایک شیخ اقبال دوسرے شیخ عبدالقادر اور تیسرے ظفر علی خاں۔ اقبال سرپرست تھے۔ اب طبل اقبال بجنے کا دور آتا ہے۔ اب وہ بیرسٹری پاس کرنے اور فلسفے کا ڈاکٹر بننے یورپ جا رہے ہیں۔ لیکن یورپ جانے سے پہلے حضرت سلطان المشائخ، محبوب الٰہی، خواجہ نظام الدین اولیاء کے مزار پر انوار پر حاضری دینی اور دعا لینی ضروری ہے۔

شیخ محمد اکرام، معاون مدیر مخزن لاہور ساتھ ہیں۔ راستے میں انبالے سے میر نیرنگ شمولیت کرتے ہیں اور دہلی میں منشی نذر محمد انسپکٹر مدارس اور خواجہ حسن نظامی ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔ منشی نذر محمد کا مکان ریلوے اسٹیشن کے قریب ہے۔ تھوڑی دیر ان کے ہاں آرام کیا جاتا ہے۔ پھر پوری پارٹی حضرت سلطان المشائخ کی درگاہ آتی ہے۔ اقبال کی خواہش کے مطابق سب گنبد کے دروازے کے پاس رک جاتے ہیں۔ اقبال تنہا گنبد میں داخل ہوتے ہیں اور مزار کے سرہانے بیٹھ کر مندرجہ ذیل نظم پڑھتے ہیں۔

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تری، فیض عام ہے تیرا
ترے وجود سے روشن ہے راہ منزلِ شوق
دیارِ عشق کا مصحف کلام ہے تیرا
نہاں ہے تیری محبت میں رنگِ محبوبی
بڑی ہے شان، بڑا احترام ہے تیرا
ستارے عشق کے تیری کشش سے ہیں قائم
نظامِ مہر کی صورت نظام ہے تیرا

کرم کرم کہ غریب الدیار ہے اقبال
مرید پیر نجف ہے غلام ہے تیرا
اگر سیاہ دلم، داغ لالہ زار توام
دگر کشادہ جبینم گل بہار توام

کیا ہے تیرے مقدر نے مداح خواں مجھکو
تجھے ہزار مبارک، مری زبان مجھکو
بھلا ہو دونوں جہاں میں "حسن نظامی" کا
ملا ہے جس کی بدولت یہ آستاں مجھکو
مرے سفینے کو تو نے کنارہ بوس کیا
اماں نہ دیتا تھا جب بحر بیکراں مجھکو
فلک نشیں صفت مہر ہوں زمانے میں
تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھکو
رہوں میں خادم خلق خدا، جیوں جب تک
نہیں ہے آرزوئے عمر جاوداں مجھکو
قسم ہے اپنے دل دردمند کی آقا
تری ثنا کے لئے حق نے دی زباں مجھکو
شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

تنہائی میں کیا کیفیت رہی ہوگی، اس کی خبر تو اقبال کو تھی یا اللہ کو باہر آکر درگاہ کے صحن میں مزار کی طرف منہ کرکے نظم دوبارہ سنائی گئی تو آواز کے درد اور لہجے کی رقت سے تمام احباب اور دوسرے سامعین بے حد متاثر ہوئے اور بے اختیار آمین و آفرین پکار اٹھے۔ عجب عالم محویت تھا۔ جو اس دن وہاں موجود تھا وہی اس کا تصور کر سکتا ہے۔

درگاہ سے خواجہ حسن نظامی کے مکان گئے۔ کھانا کھایا۔ ولایت خاں مرحوم، دلی کا مشہور قوال جس کی ابھی ابتدا تھی

مگر تو کمرے ہی میں خوش گلو اور طبیعت دار تھی، لگاتار ہا اور وقت گزرتا رہا۔ اس کے بعد شہر واپس ہوئے۔ واپسی میں پارٹی مرزا غالب کی قبر پر ٹھہری۔ میر نیرنگ قبر کی لوح کو پکڑے بیٹھے تھے اقبال دئیں جانب عالم محویت میں تشریف فرما تھے۔ ستمبر کا مہینہ تھا۔ ہوا بند تھی اور دھوپ بڑی تیز، لیکن کسی کو گرمی کا احساس نہ تھا۔ ولایت بولا "حضور! اجازت ہو تو مرزا غالب کی غزل پیش کروں۔" سرود بہ مستاں یاد دھانیدن، یہاں کسے عذر تھا۔ چنانچہ اس نے پڑھنا شروع کیا۔

دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی
دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی

غزل کے ان دو شعروں نے حاضرین میں ہلچل پیدا کر دی۔ دیکھیے کس قدر برمحل تھے۔

اڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں
بارے اب اے ہوا، ہوس بال و پر گئی

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

ولایت نے غزل ختم کی اور پارٹی ہوش بجا کر کے چلنے کے لئے اٹھی۔ اقبال نے جوش عقیدت میں غالب کی لوح مزار کو بوسہ دیا اور شہر کا رستہ لیا۔ آہ، اقبال اور احباب کی صحبتیں بھی آج افسانہ ہیں اور ان افسانوں کو بیان کرنے والے خود عنقریب افسانہ ہو چاہتے ہیں۔[1]

اقبال کے لندن پہنچنے کے بعد روداد سفر پر مشتمل ان کا ایک طویل خط "وطن"[2] لاہور میں شائع ہوا۔ اس خط کو منشی محمد دین فوق، ایڈیٹر "کشمیر میگزین" لاہور نے کشمیری میگزین میں نقل کیا اور علامہ اقبال سے ان کے "رشحات قلم" کی درخواست کی جس کا جواب علامہ نے ایک خط کی صورت میں مرحمت فرمایا، فوق مرحوم نے علامہ اقبال کا وہ خط (بصورت اقتباس) ایک تمہید کے ساتھ کشمیری میگزین میں شائع کر دیا جو درج ذیل ہے۔

"فخر قوم شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔ اے"

"کشمیری میگزین کے پہلے نمبر بابت ماہ جنوری ۱۹۰۶ء میں "ولایتی چٹھی" کے عنوان سے بھی ہم مشفق پروفیسر

---

[1] ماہنامہ "منادی" دہلی، جلد ۳۹ شمارہ ۴

[2] ہفتہ وار "وطن" لاہور مراد ہے۔ یہ خط ہفتہ وار "پیسہ اخبار" لاہور میں شائع ہو چکا ہے۔

محمد اقبال صاحب کا ایک مضمون ایک "لوکل صحیفہ[1]" سے اقتباساً درج کیا گیا تھا بعض حضرات نے اعتراض کیا کہ شیخ صاحب کے مضامین دیگر اخباروں سے نقل نہ کئے جایا کریں بلکہ ان کو توجہ دلائی جائے کہ وہ براہ راست اپنے قومی میگزین کو بھی یاد فرمایا کریں۔ بعض اصحاب نے تو یہاں تک اشتیاق ظاہر کیا ہے کہ میگزین کا ایک پرچہ بھی ان کی نظم یا نثر سے خالی نہ رہنا چاہیئے۔ ادھر تو مشتاقان کلام اقبال کو یہ لکھا گیا کہ وہ ولایت میں بغرض مضمون نگاری نہیں بلکہ بغرض تعلیم گئے ہیں اور وہ تعلیم میں وہاں اس قدر مصروف ہیں کہ ان پر فرمائشی نظم و نثر کا بوجھ ڈالنا نامناسب ہوتا ہے ادھر شیخ صاحب کی خدمت میں گذارش کی گئی کہ قوم کا بھی کچھ حق ہے۔ اگر کچھ وقت بچا کرے تو قومی مخزن (میگزین) کو بھی یاد فرمایا کیجئے۔ اس عریضہ کا جو جواب آیا وہ درج ذیل ہے۔

" ڈیر فوق۔ آپ کا خط ملا۔ الحمدللہ کہ آپ خیریت سے ہیں۔ مجھے یہ ملال تھا کہ جاتی دفعہ آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ افسوس ہے مجھے اس موقعہ پر فرصت کم تھی ورنہ کہیں نہ کہیں آپ سے ملنے کو آجاتا۔ اچھا ہوا کہ آپ نے وہ پرچہ (کشمیری میگزین) اپنی ذمہ داری پر چلانا شروع کیا۔ مجھے سخت افسوس ہے کہ یہاں کے مشاغل سے مطلق فرصت نہیں سو ایسے حالات میں مضامین لکھنے کی کہاں سوجھتی ہے البتہ شعر ہے جو کبھی کبھی خود بخود ہو جاتا ہے سو شیخ عبدالقادر (ایڈیٹر مخزن) لے جاتے ہیں۔ ان سے انکار نہیں ہو سکتا۔ آپ سے بھی انکار نہیں۔ اگر کچھ ہو گیا تو حاضر ہوگا والسلام محمد اقبال

ٹرینٹی کالج، کیمرج، انگلینڈ[2]

---

[1] ہفتہ وار "وطن" لاہور ہے۔ [2] کشمیری میگزین (لاہور) بابت ماہ اپریل ۱۹۰۶ء جلد نمبر ۱ شمارہ ۴ صفحہ ۲۲

بقیہ "سنے تو سبھی جہاں میں ہے ترا فسانہ کیا"

اور بدیہی طور پر سیاسی حکمت عملی، غرض ہر شعبہ زندگی میں نظر آرہے ہیں۔ ضرورت محسوس ہوئی کہ آج کے حالات میں ہم عرفان حق اور عرفان نفس کے مقصد کو سمجھیں اور کتاب اللہ اور سیرت سرور کائنات ؐ سے براہ راست روشنی حاصل کریں تاکہ ہم معرفت نفس در عرفان ذات کی منزلیں طے کرتے ہوئے احترام انسانیت اور ایمان و آگہی کی نعمتوں سے فیض یاب ہو سکیں اور ہماری انفرادی زندگی اور حیات ملی خودی کا اعلیٰ مظہر ہو۔ مذاکرہ "ملی تعلیمات نبوی ؐ" ـــــ خودی اس جدوجہد کا عنوان ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اس جدوجہد میں آپ کو اس طرح شریک کروں کہ آپ ادارہ لطف و کرم مذاکرہ کے انعقاد پر اپنے ایک پیغام سے مجھے اور میرے رفقائے عزیز کو نوازیں چند سطور کا یہ پیغام ہمارے لئے وجہ مسرت و تقویت ہوگا اور سال رواں میں اور اسکے بعد آواز اخلاق کے ذیل میں تحریک خودی کو آگے بڑھایا جا سکے گا۔ میں آپ سے تعاون و اشتراک اور محبت و انس کا متوقع اور متمنی ہوں۔
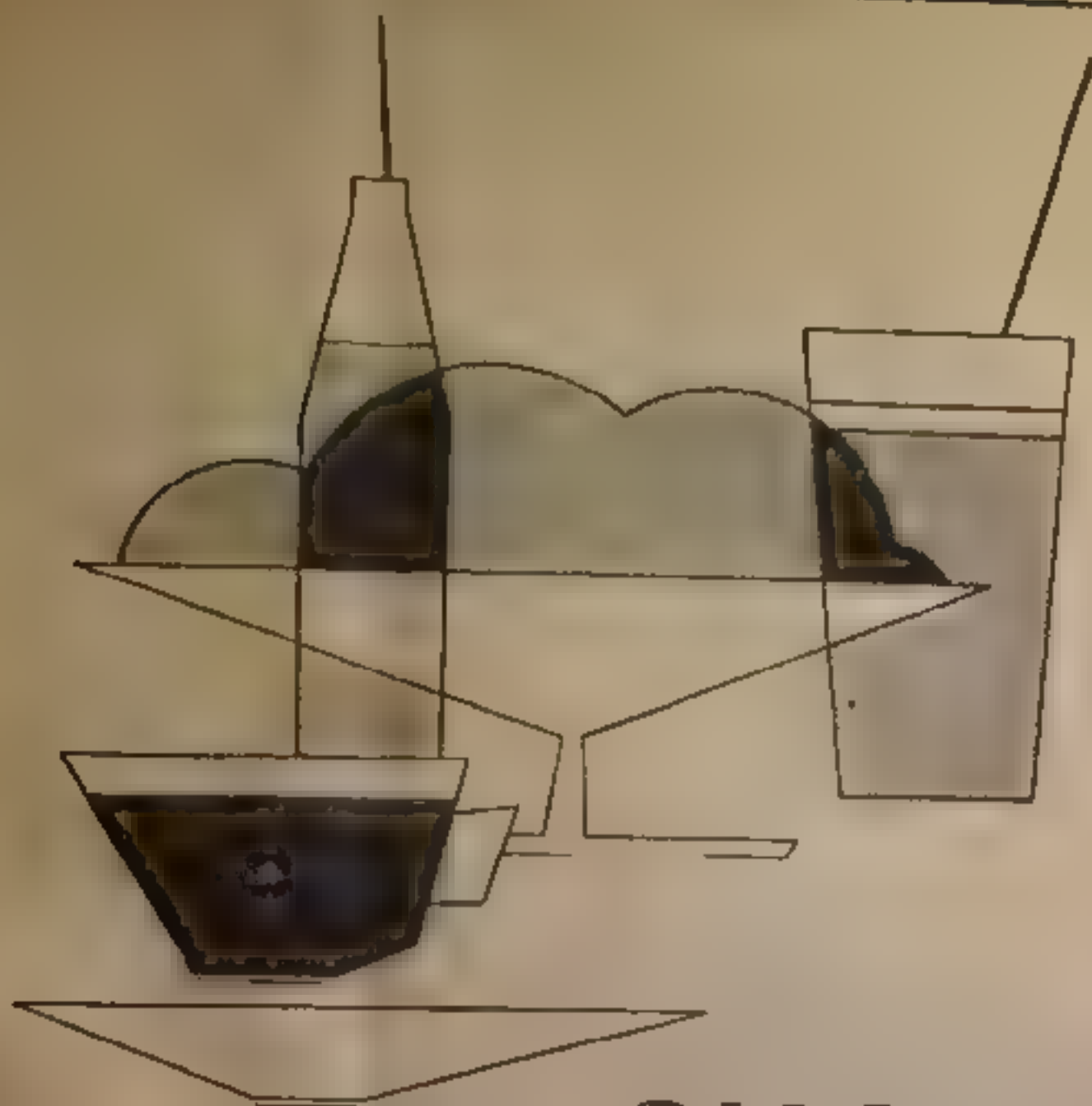
با احترامات فائقہ

ادریس احمد مینائی خالد

بحضورِ اقبال

یہ نظم پاکستان کے وجود میں آنے سے کئی سال پیشتر لکھی گئی تھی جب اہل ملت کے دل میں فراقِ اقبال کا زخم تازہ تھا تقریباً چالیس سال کے بعد تدرے ردو بدل کے ساتھ آج نذر قارئین ہے ——————— مدیر فاران

سوال

اے چمن زارِ خودی کے طوطیِ شیریں مقال
مشرق و مغرب کی آویزش کا کیا ہوگا مآل؟

بن گئی وہ آئینہ فکرِ فلک پیما تری
جس میں دیکھا قوم نے ماضی و مستقبل کا حال

اٹھ کے از یورپشیا اک قوم ریا جوجی صفات
شرق پر چھائے چلی جاتی ہے آندھی کی مثال

اس میں شر مشرق کا اور مغرب کے الحاد و فریب
اس کے پیراہن کو خونِ اہلِ ایماں ہے گلال

شرق اوسط میں جو شیطاں نے لگا رکھی ہے آگ
دامنِ دیر و حرم کا اُس سے بچنا ہے محال

خود فراموشی سکھاتے ہیں مجھے اہلِ فرنگ
تو نے اے رہبر خود آگاہی کو بتلایا کمال

فلسفہ رکھتا ہے مرگِ شوق کا درویشِ ہند
اور تو نے شوق کو ہستی کا بتلایا زلال

کیا کریں گے اہلِ دانش، کیا کریں گے اہلِ دل
جب نہ سود اسر میں ہوگا اور نہ دل میں کیف و حال؟

جواب

ارضِ مغرب میں سیاست کی بساطِ رنگ رنگ
دستِ شیطاں نے بچھا رکھے ہیں عیاری کے جال

اس کے مذہب میں روا اپنے لئے اوروں کا خوں
اس کے مکر و جور سے تاریخ کے اوراق لال

غازیوں پر اس نے درِ عشرت کدوں کے کھول کر
بچہ ہائے شیرِ نر کو کر دیا رو بہ خصال

حیف! مسلم نے کیا تہذیبِ حاضر کو قبول
یہ نہ سمجھا مسکنت ہے ابنِ آدم کا زوال

سینۂ مغرب میں برپا ہے جو اک شورِ نشور
ہے یہ ہنگامہ خدا کا اپنے بندوں سے سوال

دیدنی ہے پیل کی، پیدل کی اور فرزیں کی دوڑ
شاطرِ کامل چلا ہے پھر وہی گھوڑے کی چال

دستِ فطرت کر رہا ہے دھجیوں پہ دھجیاں
پیرہن یورپ کا تھا تدبیرِ شیطاں کا کمال

کس کے دم میں آ رہے ہیں دہر کے برنا و پیر
اے مسلماناں حذر! ایں بازی و ایں پیرِ زال

اس میں وہ سوز و سرور و جذبۂ کامل نہیں
زورِ ہر نیرنگِ باطل توڑ دے جسکا جلال

جہل کو اور ظلم و غفلت کو چھپانے کے لئے
ناسمجھ کہتے رہے ہیں "ہر کمالے را زوال"

اہلِ ہمت، اہلِ ایماں ہیں سدا مائل بہ اوج
اور دوں ہمت زوال آمادہ و آشفتہ حال

زندگی ہے سوز و شوق و جذبۂ پیہم کا نام
سخت کوش و پاک بیں و تابناک و لازوال

اے مسلماں! اے طلسمِ رنگ و بو کی لوحِ کل
ہے تری جودت سے ہستی کی جلالت اور جمال

فلسفہ ہو ہند کا، روما کا یا یونان کا
جس میں حق پیدا نہیں وہ کچھ نہیں جز قیل و قال

چشم و دل خالی ہوئے جب سوزِ الّا اللہ سے
زندگانی رہ گئی بازیچۂ وہم و خیال

جس کے دل میں کر لیا گھر سوزِ الّا اللہ نے
اس نے پائی دولتِ جاوید و عمرِ لازوال

چشمِ بینا پیش کر سکتی ہے نقشہ حشر کا
کوئی ظالم اور منافق کا نہیں پرسانِ حال

حوصلہ رکھتے ہیں تخت و تاج کا مردانِ حر
تخت انکا پشتِ مرکب تاج ان شیروں کی ڈھال

ان کا مقصد نظمِ عالم، انکا مسلک عدل و خیر
ان کو بخشا صاحبِ کل نے دم و سوزِ بلالؓ

ہونگے پھر تہذیب کے مرکز فلسطین و حجاز
پھر ہے ان نقطوں پہ ادیان و ملل کا اتصال

ہے اسی حلقے میں شامل ارضِ پاکستان بھی
ہیں یہاں بھی ذکرِ حق میں صاحبانِ حال و قال

لیکن اے فرزند! بے سوزِ عمل سب ہیچ ہے
بے عمل، ہے کوئی مستقبل نہ ماضی اور نہ حال

حُسن تو سبھی جہاں میں ہے ترا فسانہ کیا

برادر محترم مینائی صاحب! تسلیمات عرض۔

فاران کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا، شکرگزار ہوں، مولانا ماہرؔ کی زندگی میں فاران پابندی سے مل جایا کرتا تھا۔ بعد ازاں یہ پابندی برقرار نہیں رہی، میرا گمان یہی رہا کہ وقت پر شائع نہ ہوتا ہو۔ کراچی میں دورانِ گفتگو آپ نے یہ نوید سنائی کہ اب آپ اسے اپنی نگرانی میں شائع کریں گے۔ سو آج یہ شمارہ بھی مل گیا۔ آپ نے مجھے یاد رکھا، ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں۔

"فاران" کا مولانا ماہرؔ نمبر، بھی شائع ہوا تھا، کاش وہ بھی مل سکتا۔ میری لائبریری میں ہر رسالے کا (جو میرے پاس آتے ہیں) ایسا نمبر ضرور محفوظ ہے جو کسی شخصیت یا کسی موضوع پر محیط ہو۔ یوں عام شمارے بھی — کوشش کرتا ہوں کہ باضابطہ رکھوں، عموماً جلد کی صورت — اور بفضل تعالیٰ رسائل کا بھی اچھا خاصا ذخیرہ ہے۔ کبھی غریب خانے پر تشریف لائیں تو اپنی چھوٹی سی لائبریری کی سیر کراؤں گا، مجھے یقین ہے کہ آپ دیکھ کر خوش ہو جائیں گے۔ یہ سلیقہ آپ ہی جیسے بزرگوں سے سیکھا ہے یہ تمہید کچھ "خودستائی" کی سمت آگئی ہے۔ اسے "حسنِ طلب" سے تعبیر کریجیے۔ محض آپ کا اعتبار حاصل کرنا مقصود ہے ورنہ من آنم کہ من دانم۔ میں کہاں اور یہ ترے خواب کہاں۔ خیر — تفصیل خط تو ملنے کے بعد لکھوں گا۔ فی الحال خسروی صاحب کے ایک اعتراض پر یکایک نظر پڑ گئی — موصوف نے جوشؔ صاحب کی رباعی کا حوالہ دیتے ہوئے "حسنِ ظن" سے کام لیا اور استفہام انکاری سمجھ کر "عمومی اعتراض" سے گریز کا ایک پہلو نکال لیا۔ جیسے جوشؔ صاحب کی روح نے بھی "خدا کا شکر ادا کیا ہوگا" اور مجھے بھی موصوف کے حسنِ ظن پر پیار آگیا۔ مگر بیچارے قتیلؔ شفائی کے ایک شعر پر اس قدر چراغ پا کیوں ہو گئے۔ سمجھ میں نہیں آسکا۔ قتیلؔ کا شعر تو بہت صاف ہے۔ یہ تو ایک طنز ہے اُن لوگوں پر جو کسی مقام پر فائز ہو کر اپنے آپ کو خدا سے بھی بڑا سمجھنے لگتے ہیں۔ میری گزارش ہے کہ موصوف اس شعر کو یک بار پھر پڑھ لیں۔

کچھ لوگوں سے جب میری ملاقات نہیں تھی
میں بھی یہ سمجھتا تھا خدا سب سے بڑا ہے

ایسے اندازِ بیان کا اگر یہ مطلب لیا جانے لگا جو خسروی صاحب کی سمجھ میں آیا تو بات کرنے کے سارے سلیقے

سارے زاویئے ختم ہو کر رہ جائیں گے۔ اور پھر شاعرانہ طرز اظہار کا تو خدا ہی حافظ ہے۔ اسمیں تو بڑے نازک مقامات آتے ہیں۔ اگر سخن فہمی کا یہی عالم رہا تو سارا فارسی اور اردو شعری ادب غور طلب ہو جائے گا اور بہت سے شعرا کو گردن زدنی قرار دینا پڑے گا۔

جدا ہا! میرا لہجہ بھی کچھ تلخ ہو گیا ہے۔ معذرت خواہ ہوں مگر کیا کروں۔ یہ فارسی مصرعہ تو آپ کو بھی یاد آ رہا ہوگا۔

نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی

امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

مکرر:۔ میری ڈاک کراچی کے پتے پر بھی بھیجی جا سکتی ہے سروس یہاں کرتا ہوں اور رہتا وہاں ہوں۔

آپکا۔ حمایت علی شاعر
شعبۂ اردو۔ سندھ یونیورسٹی جام شورو

جناب محترم و مکرم مینائی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

ہم ۹ ربیع الاول تا ۱۳ ربیع الاول ۱۴۰۳ھ ایک مذاکرہ ملی تعلیمات نبوی — خودی کا اہتمام کر رہے ہیں۔ اس مذاکرہ میں کم از کم اسی صاحبان فکر و نظر شرکت فرما رہے ہیں اور ایک ایسے موضوع (خودی) پر اظہار خیال فرما رہے ہیں اور دینی رہنمائی دے رہے ہیں کہ جس پر از ابتدائے اسلام تا ایں دم ہر رہنما و مفکر اسلام نے تعمیر کے ذیل میں بدرجہ انتہا اہمیت دی ہے مگر جسے ہم نے اپنی ضرورت و احتیاج اور اہمیت کی فہرست سے من حیثیت الامۃ خارج کر رکھا ہے۔

خودی کا شعور و ادراک اور اس کے عملی مظاہرہ کا مطالعہ فرد کی زندگی اور حیثیت اقوام و امم کے مناظر میں کیا جانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ افراد کی زندگی میں خودی کے انجذاب کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اور اس کے عملی حصول کے لئے تعلیمات قرآن کریم سے اور حیات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایک دور اور ایک ایک واقعہ سے رہنمائی حاصل کرنا ملت اسلامیہ کی ناگزیر ضرورت ہے۔ اجتماعی زندگی کا کوئی بھی مظہر ہو — خارجہ حکمت عملی ہو یا دفاعی خود اعتمادی، اقتصادی و معاشی خود کفالتی ہو یا معاشرتی ضابطہ اخلاق میں دوسرے افراد اور گروہوں کا احترام بالآخر نتیجہ خیزی اس امر پر موقوف ہے کہ کسی معاشرے کے افراد کے قلوب و اذہان میں خودی کی آبیاری اور نشوونما کن خطوط پر ہوتی ہے۔

پاکستان میں خودی کے اطلاق و فقدان نے ہماری انفرادی اور ہماری اجتماعی زندگی میں طرح طرح کے فسادات پیدا کئے ہیں جن کے مظاہر ہمیں اپنی تہذیب و تمدن اور ثقافت و روایت، نیز اپنی تعلیم و صحت، شعر و ادب اور صحافت، صنعت و تجارت

باقی صفحہ ۳۷ پر دیکھیے

گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را

حکیم حیدر بیگ مرحوم کی ذات بمبئی کے مسلمانوں کے لیے ایسی تھی جیسی حکیم اجمل خاں مرحوم کا وجود اہلِ دہلی کے لیے، کوئی معاملہ ہو کیسا ہی ٹیڑھا مسئلہ ہو، مسلمان ہر گتھی کو سلجھانے کے لیے حکیم صاحب ہی کے پاس آتے تھے، وہ دراصل شہر بمبئی کے غیر سرکاری میئر تھے۔ اور کمالات کے علاوہ حکیم صاحب کو محفل آرائی کا خاص ڈھب تھا، مشاعرے انہوں نے ایسے ایسے کئے اور کرائے کہ اہالیان بمبئی کو ابھی تک اُن کی یاد ستاتی ہے، جنوری ۸۲ء میں ۳۶ برس کے بعد بمبئی جانا ہوا تو بعض احباب نے ۱۹۴۶ء والے بزمِ اقبال کے مشاعرے کا ٹیپ (TAPE) سنا دیا، راقم الحروف بھی اس یادگار محفل میں حکیم صاحب مرحوم کی دعوت پر شریک ہوا تھا، اقبال کے بارے میں جو قطعہ پڑھا تھا اور طرح کی جو غزل سنائی تھی۔ وہ یہاں نذرِ قارئین ہیں ——— اسمٰعیل احمد مینائی

قطعہ

نکتہ چیں کے پاس لے دے کر یہی الزام ہے ؛ شاعرِ فطرت نہیں تو شاعرِ اسلام ہے
اس حقیقت کو بھلا بیٹھا ہے لیکن کم نظر ؛ دینِ فطرت بھی تو میرے دین ہی کا نام ہے

غزل

وہ یہ کہتے ہوئے سدھارے ہیں ؛ تُو نے تنہا بھی دن گزارے ہیں
چشمِ ساقی کی سب نوازش تھی ؛ جام و مینا تو استعارے ہیں
عصمتِ غم تباہ کیوں کیجیے ؛ خامشی میں بہت اشارے ہیں
تیرے غم کا تو کیا بدل ہوتا ؛ مے و مینا سے دن گزارے ہیں

میرے اشعار جو بھی ہیں تسنیم
یا کنائے ہیں یا اشارے ہیں

بروک بانڈ کی گولڈ لیبل چائے

خوشبو والی ... لذت والی

خوشبو والی ... لذت والی

گولڈ لیبل چائے کی پیالی

manhattan international

GL 13 (U)

سید شمس الحسن دکوب

"بزمِ صالح" — ایک تذکرہ

کراچی اصلاً تجارتی اور صنعتی شہر ہے اگرچہ اپنی آبادی اور وسعت کے لحاظ سے پاکستان کا سب سے بڑا شہر ہے۔ مجھے ہجرت کے بعد جس چیز کی کمی کا شدید احساس تھا وہ یہ کہ میں یکلخت علمی اور ادبی صحبتوں سے محروم ہو گیا ہوں۔ پاکستان آنے کے بعد اگر میں نے مستقل رہائش لاہور میں اختیار کی ہوتی تو شاید اس کمی کا اتنا شدید احساس نہ ہوتا کیونکہ لاہور پہلے سے ایک علمی اور ادبی مرکز چلا آ رہا تھا اور اردو ادب کے فروغ میں ایک بڑا کردار ادا کر رہا تھا۔ لیکن کراچی میں علمی اور ادبی ماحول کا فقدان تعجب خیز نہ تھا تقسیم سے پہلے اسکی آبادی زیادہ تر ہندو تعلیم یافتہ حضرات پر مشتمل تھی۔ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد اسکی بیشتر آبادی ترکِ وطن کر کے بھارت منتقل ہو چکی تھی اس خلا کو ہندوستان سے آئے ہوئے مہاجرین نے پُر کیا۔ اور اُن میں پڑھے لکھے حضرات اور ادیب حضرات کی کافی تعداد تھی۔ مگر سندھ کے یہ نئے باشندے اپنی آبادکاری کے مسائل میں ایسے الجھے ہوئے تھے کہ انہیں اپنے تن من کا ہوش نہ تھا۔ بدقسمتی سے انکی آبادکاری بھی غیر منظم صورت میں ہو رہی تھی۔ ذرائع آمدنی بھی قریب قریب مسدود تھے۔ کراچی میں نقل و حرکت کے ذرائع بھی قلیل تھے۔ مہاجرین کے یہاں آنے کے باوجود مدتوں فکر و فکری رہی مسائل کا ان ہجوم تھا کہ انہیں تو فرصت نہیں ملتی تھی کہ وہ سماجی اور ادبی سرگرمیوں پر توجہ مرکوز کر سکیں۔ کچھ مدت کے بعد کچھ ادبی سرگرمیاں دیکھنے میں آئیں بھی تو وہ مشاعروں تک محدود تھیں۔ مجھے ادب و شاعری کا ذوق و شوق ہے لیکن مشاعروں میں شرکت میرے بس کی بات نہ تھی کیونکہ بہت دیر تک شب بیداری سے میں گھبراتا تھا۔ پھر نئے شہر میں شب میں آنا جانا ایک مسئلہ بنا ہوا تھا۔ ان مسائلات کے۔ تو جب میں فریر روڈ کے حلقے سے ناظم آباد نمبر ۳ کے مکان الوروم بہ الوبیات میں آیا تو حالات بہت کچھ بدل چکے تھے۔ مہاجرین کم و بیش آباد ہو چکے تھے اور زیادہ تر برسرِ کار ہو گئے تھے۔ ملنے کی سہولتوں میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

میرے قدیم اور مخلص دوست غلام محی الدین صاحب (کراچی پولیس) سے دورانِ ملازمت خاص خاص مواقع پر ہی ملاقات ہوتی رہتی تھی مگر قریبی تعلق اُن سے ناظم آباد نمبر ۳ آ کر قائم ہوا۔ خوش قسمتی سے جب میں نے یہاں مستقل رہائش اختیار کی

تو وہ پولیس سروس سے ریٹائر ہو کر اسی محلہ میں سکونت اختیار کر چکے تھے جیسے اُن سے دوسرے تیسرے روز ورنہ ہفتہ
میں ایک بار ضرور ملاقات ہونے لگی۔ ناظم آباد منتقل ہونے کے بعد یہاں بھی ہم سب کا ایک حلقہ احباب پیدا ہو گیا۔ اتفاق
سے میرے کئی علی گڑھ کے ہم جماعت اور مخلص دوست بھی ناظم آباد نمبر ۲ میں ہی آباد تھے اور کچھ نئے حضرات جو قرب و جوار
میں مقیم تھے اُن سے بے تکلفانہ اور مخلصانہ تعلقات پیدا ہو گئے۔ چنانچہ ہر روز میرے یہاں احباب کا اجتماع ہوتا تھا۔ غلام
محی الدین صاحب بھی اکثر اس میں شریک ہونے لگے تھے۔ اسی دوران انہوں نے مجھ سے محمد صالح صاحب کا اور ان کے یہاں
ہر اتوار کو جو ادبی محفل ہوتی تھی اُس کا ذکر کیا اور اصرار کیا کہ میں "بزم صالح" میں شرکت کیا کروں اور ہر اتوار کو اپنے
احباب کا اجتماع ملتوی کر دوں۔ اسی کے بعد غلام محی الدین صاحب نے میرا تذکرہ محمد صالح صاحب سے کیا اور انہیں بتایا کہ میں
ناظم آباد نمبر ۲ میں ہی مستقل رہائش اختیار کر چکا ہوں۔ چنانچہ اس کے بعد جب اتوار کا دن آیا تو محمد صالح صاحب نے اپنی یہاں کی
بزم میں شرکت کی خصوصی دعوت ہی نہیں دی بلکہ مجھے گھر سے لانے کے لئے اپنی موٹر بھیج دی جس کا سلسلہ اُن کی وفات
تک قائم رہا۔ اس طرح میرا پہلا تعارف محمد صالح صاحب سے ہوا اور میں ہر اتوار کو پابندی سے بزم صالح میں شرکت کرنے لگا۔
محمد صالح صاحب کی شخصیت نے مجھے بے حد متاثر کیا اور مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ جیسے وہ میرے بہت قدیم اور مخلص دوستوں
میں ہیں۔ اسی جذبہ کا اظہار حضرت جگر مرادآبادی نے اپنے ایک شعر میں خوب سمویا ہے۔

آدمی آدمی سے ملتا ہے
دل مگر کم کسی سے ملتا ہے

مجھے انکی جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان کی زندگی کی سادگی اور اعلیٰ حسن اخلاق تھی۔ وہ مشرقی تہذیب
کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ وضعداری اور خاکساری اُن میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ اس طرح ملتے کہ جیسے دعوت
دے کر وہ ہم پر کوئی احسان نہیں کر رہے ہیں بلکہ ہم شریک ہو کر اُن کو منت پذیر کر رہے ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات
نہ تھی۔

ابتدا میں جب میں نے بزم صالح میں جانا شروع کیا تو شرکا کی تعداد محدود تھی۔ اُس وقت جو حضرات پابندی سے
شرکت کرتے تھے اور جن کے نام ذہن میں رہ گئے ہیں وہ یہ ہیں۔ غلام محی الدین صاحب اشرفی، سید امیر حسین صاحب اثر
نابینا حکیم ماہر صاحب دہلوی ماہر۔ دعا ڈبائیوی، مظہر جلیل شوق، محمد یوسف ، مولانا اعجاز احمد قدوسی ـــ، حبیب اللہ
خاں ـــ (سابق ڈپٹی ایس پی پولیس) ۔ مرزا محمود بیگ صاحب، احمد اشرف صاحب (سابق ڈپٹی ڈائرکٹر اسٹیٹ بینک)
ان میں اول الذکر پانچوں حضرات مستقل اپنا کلام سناتے دیگر حضرات کی حیثیت سامع کی تھی۔ حکیم ماہر صاحب دہلوی آخر میں اپنا کلام

پیش کرتے۔ وہ پُرگو تھے اور کافی طویل غزلیں سناتے جو قدیم رنگ تغزل کا نمونہ ہوتی تھیں مگر طویل طویل ہونے کی وجہ سے بعض شرکاء کی طبیعت اوبنے لگتی تھی پھر بھی سب حضرات ان کی بزرگی کا احترام کرتے اور خاموشی سے ان کے اشعار سن کر داد دیتے محمد صالح صاحب سے ان کے دیرینہ خاندانی تعلقات اور مراسم تھے۔ رعنا ڈبائیوی بھی بہت اچھے شاعر تھے۔ نوح ناروی مرحوم کے شاگرد اور ان ہی کے رنگ میں شعر کہتے تھے۔ زبان کے اکثر شعر کہتے۔ عروض سے بھی بہت واقف تھے وہ محمد صالح صاحب کے ہم زلف تھے۔ اور میرے بھی بہت مخلصانہ تعلقات اُن سے ہو گئے تھے اور کبھی کبھی میرے یہاں بھی تشریف لاتے تھے۔ جب اور کراچی کے مشہور شعراء آنے لگے تو ان دونوں شعراء نے یعنی ماہر دہلوی اور رعنا ڈبائیوی نے "بزم صالح" میں پابندی سے آنا چھوڑ دیا ان دونوں کی موجودگی میں ہی کراچی کے اور مشہور حضرات بھی آنے لگے تھے۔ جیسے اسمٰعیل مینائی تسنیم، مظہر ——— ماہر القادری فضلی صاحب، حبیب احمد صدیقی صاحب۔ راغب مراد آبادی، ڈاکٹر انعام احسن۔ حکیم اشرف صاحب اشرف، ادیب گونڈوی صاحب۔ اقبال عظیم صاحب، بعد میں بزم صالح میں پابندی سے شریک ہونے لگے اور بزم صالح کا ہر طرف چرچا ہونے لگا۔ دیگر شعراء اور سخن فہم اور صاحب ذوق حضرات کو یہاں آنے میں دلچسپی ہو گئی یہی نہیں بلکہ کوئی شاعر بھارت سے آ جاتا یا لاہور سے کراچی کسی سلسلہ میں وارد ہوتا تو وہ بھی کسی نہ کسی دوست کے ہمراہ ضرور بزم میں آکر شریک ہوتا۔ لاہور سے آنے والوں میں پروفیسر مرزا منور صاحب کا نام تو یاد ہے۔ بدقسمتی سے اور اہم شخصیتوں کے نام ذہن میں نہیں رہ گئے۔ ہاں شیخ شکور صاحب ایک بزرگ کا نام بھی یاد آتا ہے جن سے رونق محفل بڑھتی تھی۔ کبھی کبھی آنے والوں میں جو نام مجھے یاد آ رہے ہیں وہ ہیں اُبید فاضلی۔ مسٹر دہلوی۔ جام لڑائی۔ سید محمد جعفری صاحب۔ ذوالفقار بخاری صاحب۔ ڈاکٹر احمر رفاعی۔ اعظم خسروی۔ فراست رضوی صاحب۔ راز مراد آبادی صاحب۔ مولانا عزیز الحق صاحب، ظہیر رضوی۔ خان عارف، ڈاکٹر وصاف، یہ سب حضرات اپنا کلام سناتے اور محفل کی رونق بڑھ جاتی تھی سامعین کی حیثیت میں ڈاکٹر عبدالسلام صاحب اور مظفر احمد نقطہ صاحب کے نام نامی ذہن میں ہیں۔ یہ تمام حضرات سخن فہم اور بہت ستھرا ذوق شاعری رکھتے تھے۔ بعض وقت یہ تعداد تیس چالیس افراد سے بھی بڑھ جاتی تھی۔

عام طور پر ایسی مجالس جن میں کھانے پینے کا بھی اہتمام ہوتا ہو اگر بغیر پہلے اطلاع کے حاضرین کی تعداد بڑھ جائے تو میزبان کے لئے پریشان کن مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ کتنے ہی افراد عین وقت پر آ جائیں لیکن صالح صاحب کے ماتھے پر شکن تک نہیں آتی تھی بلکہ بڑی فراخ دلی اور مسرت کے ساتھ سب کا خیر مقدم کرتے اور خاطر داری میں کوئی فرق نہیں آنے دیتے۔ جب شرکاء کی تعداد بہت بڑھنے لگی تو میں نے غلام محی الدین صاحب اور سید امیر حسن صاحب نے محمد صالح صاحب کو مشورہ دیا کہ بزم صالح کے انعقاد کو ہفتہ وار کے بجائے ماہانہ اجتماع میں تبدیل کر دیجئے۔ لیکن وہ ....

زیرِ بحث مسئلہ اگر بات کو ٹال جاتے اور اس تبدیلی پر تیار نہ ہوتے۔ اب یہ سبب ہے کہ اس محفل کی ترتیب اور پروگرام کیا رہتا تھا اور علاوہ شاعری کے ادبی تفریحات رہتی تھیں۔ جو شخص بھی اس بزم میں آتا اور جہاں جگہ دیکھتا بیٹھ جاتا۔ اگر وہ شاعر ہے تو اپنے اشعار یا غزل بلا تکلف سنا دیتا۔ شعر سنانے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ پہلی نشست ۱۱ بجے سے ۱۲ بجے تک رہتی پھر محمد صالح صاحب ۔۔۔ جملہ شرکاء کو چائے اور مختلف قسم کی اشیائے خوردنی کے لئے بلاتے۔ یہ تمام چیزیں مع خالی پلیٹوں کے چوکیوں پر سجا دی جاتیں اور سب لوگ فرش پر بیٹھ کر مہمان داری کا حق ادا کرتے۔ خود صالح صاحب ایک گوشے میں الگ بیٹھ کر پیالیوں میں جو قطار در قطار پہلے سے رکھی ہوتیں ہر مہمان کے لئے چائے انڈیل انڈیل کر پیالی بڑھا دیتے اکثر۔۔۔۔ اشیائے خوردنی کے اقسام بدلتے رہتے۔ بعض وقت موسمی پھلوں کا اہتمام کرتے۔ خصوصاً آم کی فصل میں اچھے قسم کے آم سیر ہو کر شرکاء کو کھلاتے اور چائے کے عوض دودھ کا بہترین شربت پلواتے یہی نہیں سال میں دو چار بار پُرتکلف اور لذیذ کھانے کھلاتے۔ کبھی لذیذ قسم کی نہاری یا پائے شاہی ٹکڑوں کے ساتھ پیش کرتے کبھی متنجن اور زردہ غرضیکہ مہمان نوازی میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ اور سب کی خاطر داری کر کے خوش ہوتے۔ ایسے ظرف کے لوگ بہت کمیاب ہیں اس خاطرداری کے بعد دوسری نشست تقریباً آدھا یا پون گھنٹہ رہتی۔ اس میں جو شعراء رہ جاتے وہ اپنا کلام سنا دیتے ورنہ دلچسپ گفتگو کا سلسلہ رہتا۔ کوئی شخص محفل میں تاخیر سے پہنچتا تو اسکی بھی اسی شان سے صالح صاحب خاطرداری کرتے بزم صالح خالص مشرقی انداز کی تھی۔ بڑے کمرے میں صاف ستھری چاندنی یا قالین بچھے ہوئے ہوتے۔ دیواروں سے ملحق جابجا گاؤ تکئے لگے ہوئے بیچ میں سلیقے سے اگالدان رکھے ہوئے۔ ایک پلیٹ میں سگرٹیں رکھی ہوتیں۔ ماہر القادری صاحب کثرت سے پانی پیتے تو ایک ٹھنڈے پانی کا جگ اُن کے سامنے رکھ دیا جاتا اور وہ وقفے وقفے سے پانی پیتے رہتے۔ چائے وغیرہ کے دور کے بعد تھالی میں پان مع الائچیوں اور قوام کی شیشی کے گردش کرنے لگتی۔ دورانِ محفل محمد صالح صاحب کمرہ کے آنے والے دروازہ کے پاس سمٹے ہوئے بیٹھے رہتے، کوئی آتا تو اٹھ کر اُس کا خیر مقدم کرتے اور اُسے محفل میں بٹھاتے۔۔

بزم صالح میں کبھی کبھی حضرت مولانا محمد ایوب دہلوی مرحوم و مغفور بھی تشریف لے آتے تو شاعری کے بجائے محفل مجلس تقریر و وعظ میں تبدیل ہو جاتی اور شرکاء انکے ارشاداتِ عالیہ سے مستفیض ہوتے حضرت مولانا مرحوم اس دور کے علماء ہی نہیں بلکہ اپنے وقت کے امام رازی تھے اور منطقی استدلال کے ساتھ آیات قرآنی کی تشریح اور توضیح اپنے مخصوص انداز میں فرماتے اور نکتہ میں نکتہ پیدا کرتے۔ بزم صالح رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں بجائے صبح کے عصر کے وقت منعقد ہوتی تھی محمد صالح صاحب افطار اور پرتکلف طعام کا انتظام کرتے۔ افطار کے بعد نماز مغرب باجماعت ادا کی جاتی اور تراویح کے وقت سے پہلے محفل ختم ہو جاتی۔ پورے رمضان المبارک بزم صالح میں صرف نعتیہ کلام سنایا جاتا۔ غزلیات کا سلسلہ بند ہو جاتا تھا۔ یہیں پابندی سے

شرکت کے باوجود شاذ ہی اشعار سناتا تھا - میں یہ زیادہ پسند کرتا تھا کہ دوسروں کے کلام سے لطف اندوز ہوں - بجائے اس کے اپنے اشعار سناؤں علاوہ شاعری کے بزم صالح میں دلچسپ لطائف بیان ہوتے - کبھی کبھی عصر حاضر کے حالات اور واقعات پر تبصرہ کچھ لوگ کر دیتے .... پرانے اور جدید شعراء کے بہت اچھے اچھے اشعار سننے میں آجاتے - سب سے زیادہ دلچسپ اور پر لطف وقت وہ ہوتا تھا جب ماہر القادری صاحب اور راغب مراد آبادی صاحب برجستہ اشعار بطور تفریح موزوں کر کے ایک دوسرے پر فقرے چست کرتے - اسی طرح بعض ایسے شعراء بھی تھے جو بے ربط اور بے تکے الفاظ اور تراکیب کے ساتھ اپنے اشعار سناتے تو اسمٰعیل مینائی صاحب اور ماہر القادری اس انداز سے داد دیتے کہ لطف ہی آجاتا - واقعہ یہ ہے اسمٰعیل احمد مینائی صاحب اپنی دلچسپ گفتگو اور فقروں سے محفل میں جان ڈال دیتے تھے - ماہر القادری صاحب جب اپنے اشعار سناتے تو عام طور پر اپنی غزلوں کے تین تین چار چار اشعار سناتے اس پر اسمٰعیل احمد مینائی صاحب یہ فقرہ چست کرتے "ماہر صاحب کٹ پیس سے کام نہیں چلے گا"۔ ماہر صاحب بڑی معصومیت سے مسکرا دیتے - عام طور پر ماہر صاحب بزم میں آتے تو بیاض نہیں لاتے جو شعر یاد آجاتے سنا دیتے - اسلئے انکی غزلوں کے کئی اشعار چھوٹ جاتے تو مینائی صاحب لقمہ دیتے کہ حضرت فلاں فلاں شعر تو آپ چھوڑ ہی گئے بعض دوست کہتے کہ کیا اسمٰعیل مینائی صاحب کی غزل ماہر صاحب سنا رہے تھے تو ماہر صاحب خود بہت لطف اٹھاتے اور اشارہ پاکر وہ اشعار بھی سنا دیتے اور شرکا بے ساختہ ہنسنے لگتے - واقعہ یہ ہے کہ اسمٰعیل احمد مینائی صاحب کا حافظہ بہت قوی ہے اور نہ معلوم کتنے اشعار شعراء کے یاد ہیں - وہ اچھے شاعر اور سخن فہم انسان ہیں اور علم مجلسی کے ماہر ہیں - یہ عجیب بات ہے کہ وہ بزم صالح میں بہت ہی کم اور بڑے اصرار کے بعد شعر سناتے لیکن اپنی باتوں اور فقروں سے بزم صالح کو چمکا دیتے تھے۔ بزم صالح کے مستقل شریک ہونے والے شعراء جن کے اشعار ہر صحبت میں سنے جاتے تھے اور مرکز توجہ تھے ان میں مظہر جلیل شوق، ماہر القادری فضلی، حبیب احمد صدیقی - اقبال عظیم - غلام محی الدین اور سید امیر حسن کے اسمائے گرامی لئے جاسکتے ہیں یہ تمام شعراء صاحب دیوان اور شہرت یافتہ شعراء ہے انکے کلام پر تبصرہ الگ مضمون ہی کی صورت میں کیا جاسکتا ہے - اندرون ملک یا باہر کوئی ایسا مشاعرہ نہ ہوتا جس میں ماہر القادری اور اقبال عظیم شریک نہ ہوں - ان چوٹی کے شعراء میں حبیب احمد صدیقی صاحب ایسے شاعر ہیں جو خوش گو ہونے کے باوجود خود کو گمنامی میں رکھنا پسند کرتے ہیں وہ نہ مشاعروں میں شرکت کرتے اور نہ اپنے اشعار از خود اشاعت کے لئے بھیجتے - حد یہ ہے کہ ان کے دیوان میں کوئی مقطع نہیں ملے گا - میں ان کے کلام پر ایک مبسوط تبصرہ دو قسطوں میں العلم رسالہ میں شائع کرا چکا ہوں جس سے انکی شاعری کی عظمت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے - حبیب احمد صدیقی، گرچہ مسلم یونیورسٹی میں میرے ہم جماعت تھے اور بی اے وہاں سے ہم دونوں نے ایک ساتھ کیا - لیکن ہوسٹل کے فرق اور انکی کم آمیزی کی وجہ سے وہاں کوئی خاص ارتباط نہ رہا اور نہ میں انکی ادبی اور شاعرانہ عظمت سے پہلے واقف ہو سکا۔

میرے انکے مخصوص تعلقات پاکستان میں آنے کے بعد ہوئے اور جو فصل طالب علمی کے زمانہ میں ہم دونوں کے درمیان رہا تھا وہ اس تیزی سے ختم ہوا کہ مجھے خود حیرت ہے انکی شخصیت بہت دلکش اور ان کا انداز شاعری منفرد ہے - جگر مراد آبادی تک ان کی شاعری کے بعد معترف تھے! جگر تو حبیب صاحب کی ان خصوصیات کا علم تسکین قریشی صاحب کے خط سے ہوا تھا - اور جب اُن سے پاکستان میں سابقہ پڑا تو تسکین صاحب نے ان کے متعلق جو کچھ لکھا تھا وہ میں نے حرف بہ حرف صحیح پایا حبیب صاحب طبعاً کم آمیز ہیں اور بہت سنجیدہ مزاج تحریر اور گفتگو میں بھی بے حد محتاط ماہر القادری صاحب سے یوں تو بہت پہلے سے مجھے غائبانہ تعارف حاصل تھا مگر میرے ذاتی تعلقات ان سے پاکستان آنے کے بعد قائم ہوئے اور جب وہ ناظم آباد نمبر ۲ میں آگئے تو اور بھی قربت حاصل ہوگئی - انہوں نے میرے مکان کے قریب ہی مکان خرید لیا تھا اور مستقل رہائش اختیار کر لی تھی - وہ اکثر میرے غریب خانہ پر آتے رہتے تھے اور اور میرے بڑے قدر دانوں میں تھے وہ سال میں بڑے پیمانے پر طعام کی دعوتیں دیتے تو مجھے ضرور بلاتے ماہر القادری صاحب اچھا کھاتے تھے اور دوستوں کو اچھا کھلاتے تھے - وہ لذیذ کھانے کے بے حد شوقین تھے - بہت لوگ انکی دعوتیں کھاتے اور مختلف کھانوں پر تبصرہ کرتے اور لطف اٹھاتے - ماہر صاحب بزم صالح میں جب تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھتے اور شاعری کا دور چلتا تو اکثر بیٹھے بیٹھے سو جاتے تو اسمٰعیل مینائی جو ان کے بہت مخلص اور قلبی دوست تھے بلند آواز سے کہتے "ماہر صاحب فلاں صاحب اپنا کلام سنا رہے ہیں" تو وہ چونک اٹھتے اور بہت معصومیت سے کہتے کہ "جی ہاں میں سن رہا ہوں" تو پوری محفل ہنسنے لگتی - ان سے کوئی عمر پوچھ لیتا تو بہت کم عمر بتاتے - خضاب ایک پابندی سے لگاتے - شطرنج کے بے حد شوقین تھے - اکثر موٹر دوپہر میں آتی انکو راستے سے لیتی تو معلوم ہوتا کہ سید صاحب جو ان کے پڑوسی تھے وہاں بیٹھے ہوے شطرنج کھیل رہے ہیں - ماہر صاحب کی بہت معصوم اور دلکش شخصیت تھی - قومی اور مذہبی معاملات میں بہت حساس تھے اور بہت جلد متاثر ہو جاتے اور پریشان رہتے - وہ صاف دل اور کھل کر بات کرتے اور نقد و تبصرہ کرنے میں بیباک تھے - بدعات کے سخت خلاف تھے - اور پاکستان کو خالص اسلامی حکومت دیکھنے کے متمنی تھے -

فضلی صاحب سے بھی غائبانہ طور پر تعارف پہلے سے تھا مگر میرے ذاتی تعلقات بزم صالح کے ذریعہ ہی قائم ہوئے فضلی صاحب بھی بہت اچھے شاعر اور ادیب تھے صنف غزل کے شیدائی تھے ان کے مکان کا نام ہی بیت الغزل تھا - وہ خود اپنی ذات میں بھی بیت الغزل تھے فضلی صاحب کے جگر صاحب سے آخری عمر میں بہت مخلصانہ تعلقات پیدا ہو گئے تھے اور پاکستان میں اُن کے یہاں ایک دو بار قیام بھی جگر صاحب نے کیا تھا - فضلی صاحب بڑی ہمت کے انسان تھے - بڑی سخت بیماریاں جھیلے رہے - لیکن کبھی مایوسی کا سایہ بھی نہیں دیکھا گیا - انتہائی کمزوری کے باوجود بزم صالح میں کبھی کبھی آجاتے اور اپنے تازہ اشعار سناتے - جگر صاحب نے آتش گل میں ان کی شاعری کی عظمت کا اعتراف کیا ہے اور یہ قطعہ بند

شعر کہہ گئے ہیں۔

میرا ہے جگر یہ قول فیصل — کچھ لوگ اگرچہ ہوں کبیدہ
فضلی سے ہے، آبرو غزل کی — ہر صنف سخن میں برگزیدہ

فضلی صاحب گورنمنٹ کے بڑے عہدوں پر فائز رہے لیکن اُن میں کسی قسم کا تکبر یا غرور نہ تھا وہ بڑے دردمند انسان تھے۔ مجھ سے بڑی محبت سے ملتے۔ اکثر وہ جگر صاحب کے کسی معرکہ پر اپنی یہاں مشاعرہ کرتے تو مجھے ضرور بلاتے میں نے جو جگر صاحب پر جو ایک مقالہ لکھا ہے وہ انہوں نے دیکھا تھا۔ جب ملتے تو کہتے کہ اس کو جلد طبع کرایئے۔ افسوس ہے کہ میں انکی زندگی میں طبع نہ کرا سکا اور جب میں نے اسکو طبع کرنے کا ارادہ کیا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

اقبال عظیم صاحب سے بھی میرے تعلقات بزم صالح کے ذریعہ ہی وجود میں آئے۔ وہ بزم صالح کے بہت مقبول شاعر تھے اور عام مشاعروں میں بھی بہت نمایاں مقام رکھتے تھے۔ شعر کہتے بھی خوب ہیں اور پڑھتے بھی خوب ہیں۔ بینائی چلی جانے کے باوجود بہت زندہ دل انسان ہیں اور میرے ان کے بہت مخلصانہ تعلقات ہیں ان کا دیوان "مضراب" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اور نعتیہ کلام کا مجموعہ بھی۔ غزل کی زبان میں وہ سیاسی اور معاشرتی حالات کو بہت خوبصورتی سے ادا کرنے کا ملکہ رکھتے ہیں اور انکے اشعار میں تغزل کی چاشنی ہوتی ہے۔

بہر حال یہ وہ جانی پہچانی شخصیتیں ہیں جن پر اس مضمون میں بھرپور تبصرہ ممکن نہیں لیکن وہ تین شخصیتیں جن کا ذکر کئے بغیر بزم صالح پر مضمون ناقص رہ جائے گا وہ ہیں مظہر جلیل شوق۔ غلام محی الدین صاحب اشرفی اور سید امیر حسن صاحب یہ تینوں حضرات بزم صالح کے جزو لاینفک کا درجہ رکھتے تھے۔ اور بزم صالح کے قیام اور فروغ میں ان کا نمایاں حصہ رہا ہے ان کا کلام مشاعروں میں سنا جاتا تھا اور نہ رسائل وغیرہ میں طبع ہوتا تھا یہ تینوں اگرچہ گمنام شعراء کی صف میں تھے۔ مگر بہت اچھے اور معیاری شاعر تھے۔ غلام محی الدین صاحب اشرفی کے اشعار پر جگر صاحب کی چھاپ صاف طور پر ملتی ہے بہت عمدہ کلام تھا اور بہت ستھرا ادبی اور شاعرانہ ذوق رکھتے تھے۔ وہ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی بہت اچھے اشعار کہتے تھے اور بزم صالح میں فرمائش کر کے ان کا فارسی کلام بھی سنا جاتا تھا۔ غلام محی الدین صاحب سے بھی جگر صاحب اور تسکین قریشی صاحب سے بہت گہرے اور مخلصانہ تعلقات تھے۔

سید امیر حسن صاحب منجھے ہوئے شاعر تھے۔ زبان کے بہترین شعر کہتے اور اپنی ذات سے انجمن تھے بزم صالح کے مخصوص حضرات کو وہ اکثر اپنے جائے رہائش اورنگ آباد میں مدعو کرتے اور دعوت دیتے۔ اور وہاں بھی شاعری کا دور ہوتا۔ امیر حسن صاحب بہت بذلہ سنج اور ذہین انسان تھے۔ تاریخ گوئی کا بھی انہیں بہت شوق تھا۔ مظہر جلیل شوق،

جگر صاحب کے خاص بچپن کے دوست تھے ان سب صاحبان سے میرے مخصوص تعلقات آخر وقت رہے - میں نے ان تینوں کی زندگی میں چاہا تھا کہ ان کی شاعری پر الگ الگ مقالے لکھوں اور ان کا کلام یاران وطن کے سامنے پیش کروں چنانچہ تینوں اصحاب کی بیاضیں لیکر میں نے اشعار کا نوٹ کر رکھے تھے اور ان سب سے صرف یہ درخواست کی تھی کہ وہ تینوں اپنے اپنے حالات زندگی لکھ کر مجھے دیدیں - لیکن یہ تینوں اصحاب باوجود وعدے کے لکھ کر نہیں دے پائے - اور یکایک رحلت کر گئے - بہر حال اب بھی انشاء اللہ غلام محی الدین اور محسن کے کلام پر تبصرہ لکھنے کا ارادہ ہے تاکہ ارباب ادب کو معلوم ہو سکے کہ یہ دونوں عام سطح سے کتنے بلند شاعر تھے اور اس کے علاوہ جو کچھ اشعار میں نے نوٹ کر رکھے ہیں وہ محفوظ ہو جائیں - کیونکہ مجھے امید نہیں کہ ان کے ورثاء انکے کلام کو شائع کر سکیں گے -

بزم صالح میں ظریفانہ شاعری کے تین ستارے تھے - ایک سید محمد جعفری صاحب دوسرے مسٹر دہلوی اور تیسرے ڈاکٹر انعام احسن صاحب - تینوں کی ظریفانہ شاعری کا رنگ جدا جدا تھا - اور لوگ ان سے اچھی طرح واقف ہیں - ڈاکٹر انعام احسن صاحب پابندی سے بزم صالح میں شریک ہونے والوں میں تھے - اور اپنی منفرد ظریفانہ شاعری سے محفل کو گرماتے رہتے تھے - ان کا دیوان شائع ہو گیا ہے اور اُن کا کلام اخبارات میں بھی کبھی کبھی شائع ہوتا رہا ہے وہ پیشہ کے لحاظ سے کامیاب آنکھوں کے ڈاکٹر ہیں - میرے استاد احسن مارہروی کے صاحبزادے ہیں جن کا شمار داغ کے نامور شاگردوں میں ہوتا ہے - وہ مسلم یونیورسٹی کے انٹر کالج میں اُردو کے استاد تھے - ڈاکٹر انعام پیدائشی ہکلے ہیں - لیکن بہت ذہین اور طباع آدمی ہیں - انہوں نے اپنے ظریفانہ کلام میں اپنی ہکلاہٹ پر عجیب عجیب اشعار نکالے ہیں -

میں نے جن مستقل شریک ہونے والوں کا اوپر ذکر کیا ہے اُن میں سے بیشتر اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں صرف اسمٰعیل مینائی صاحب ڈاکٹر انعام احسن صاحب، اقبال عظیم، اور یہ خاکسار بقید حیات ہیں - جب ان مرحوم دوستوں کا خیال آتا ہے تو بے ساختہ میرا یہ سادہ سا شعر زبان پر آجاتا ہے -

آج تک روتا ہے دل اس بات پر
کیسے کیسے لوگ ہم نے کھو دیئے

محمد صالح صاحب کے انتقال پُر ملال کے بعد ہی یہ معیاری محفل ادب ختم ہو گئی لیکن صالح صاحب اپنے دوستوں کے دل پر ایک غیر فانی نقش چھوڑ گئے - وہ خود نہ شاعر تھے اور نہ ادیب مگر ادب نواز تھے اور شعراء کے قدردان تھے - اُن کا وطن مالوف دہلی تھا اور جہاں تک مجھے علم ہے وہ پہلے ریلوے میں ملازم تھے - پھر وہ ریلوے کے بڑے کنٹریکٹر بن گئے اور بہت تیزی سے ترقی کرتے چلے گئے - بے حد مخیر انسان تھے مجھے اندازہ ہے کہ بہت خاموشی سے ضرورت مندوں کی امداد

بھی کرتے رہتے تھے اور اس کا کبھی ذکر کسی کے سامنے نہیں آنے دیتے تھے - تعلیمی - اصلاحی اور مذہبی اداروں سے وابستگی رکھتے تھے آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی مجلس عاملہ کے نہ صرف رکن تھے بلکہ سیٹھ محمد یوسف صاحب کے انتقال پر ملال کے بعد اس کے خزانچی تادم آخر رہے - دو بار حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شیدائیوں میں تھے - نعتیہ اشعار سنتے تو بہت متاثر ہوتے اور انکی آنکھیں نم ہو جاتیں - میں نے ان کی زبان سے کسی کی برائی نہیں سنی. اور آخر وقت تک ان کی وضعداری میں فرق نہیں آیا - کوئی دوست علیل ہو جاتا خواہ گھر پر ہو یا اسپتال میں فوراً عیادت کو جاتے - وہ خود بیمار بھی ہوتے تو حتی الوسع بزم صالح کو اتوار کے دن ملتوی نہ کرتے اور شریک ہو جاتے - انہیں اپنی زندگی میں بہت سے دوستوں کا صدمہ اٹھانا پڑا - اور بزم صالح کے ایک ایک کرکے کئی اصحاب اللہ کو پیارے ہو گئے - ماہر القادری صاحب کی وفات کی جب انہیں خبر ملی تو ان پر بہت اثر ہوا تھا اور ملالت کی حالت میں یہ معلوم ہوا کہ مکۃ المکرمہ میں یکایک ماہر القادری اللہ کے جوار رحمت میں پہنچ گئے تو بہت آزردہ ہوئے -

آخر عمر میں انہیں اپنے جوان بیٹے کی مرگ غریب الوطنی کا صدمہ دیکھنا پڑا - جو پیشہ کے لحاظ سے انجینئر تھے اور ہر بنارڈکوں میں تھے - یمنی حکومت میں ملازم تھے - وہاں سے نوجوانی میں حج کے لئے حجاز پہونچے تھے - وہاں انہوں نے حج مکمل کیا ہی تھا کہ یکایک ان کا انتقال ہو گیا - جوان تھے - ان کی شادی ہونے والی تھی - ظاہر ہے کہ کیا کچھ صدمہ صالح صاحب کو پہونچا ہوگا مگر وہ انتہائی صبر و ضبط سے کام لیتے رہے - اس حادثہ نے لیکن ان کی صحت پر اور بڑا اثر کیا -

محمد صالح صاحب حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحی صاحب خلیفہ مجاز حضرت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بہت تعلق خاطر رکھتے تھے - اور ہر جمعہ کو ان کے وعظ میں شرکت کیا کرتے تھے اور اکثر ان کے ہمراہ میں بھی جایا کرتا تھا - اسی نسبت کا اثر تھا کہ حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحی صاحب نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی اور تجہیز و تکفین میں شریک ہوئے - اللہ تعالیٰ محمد صالح صاحب اور ان کے جملہ رفقاء کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے - آمین - جب یہ سب باتیں یاد آتی ہیں تو راشد خاں جوہر کا یہ شعر حقیقت بن کر سامنے آنے لگتا ہے -

وہ عہد رفتہ وہ دور ماضی کبھی جو آتا ہے یاد جوہر
تو سوچتا ہوں وہ زندگی تھی کہ خواب تھا کوئی زندگی کا

اور اسی کے ساتھ فراق گورکھپوری کا یہ شعر دماغ میں چکر لگانے لگتا ہے -

اب یاد رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

حقیقت یہ ہے کہ میں نے بزم صالح پر جو کچھ لکھا وہ اب بھی کم ہے اور نہ معلوم کتنے واقعات اور تذکار رکھے

نام ذہن سے فی الحال محو ہیں ۔ یہ عجیب سانحہ ہے کہ ہم لوگ زندگی کے واقعات اور حالات نیز دوستوں کے شخصی تاثرات سے گزرتے ہوئے ان کو قلمبند نہیں کر لیتے اور بعد کو بہت سی باتیں بھول میں پڑ جاتی ہیں ۔ تو بڑا افسوس ہوتا ہے۔

ناطق کے اس شعر پر اپنا مضمون ختم کرتا ہوں ۔ کیا خوب کہا ہے سو

یاد کرنے کی تو باتیں ہیں بہت سی ناطق
پہلے وہ بھول تو جاؤں جو فراموش نہیں

جلیل قدوائی

لوگ مجھ سے میری خیریت دریافت کرتے ہیں اور میں نے اپنا احوال سنانا شروع بھی نہیں کیا ہوتا کہ دوسری باتیں کرنے لگتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی پوچھنا ہوا!

استاد وہ اچھا جو عمر بھر طالب علم رہے۔

ہیروں سے بھرا اور جواہرات سے جڑا مکان اپنے مالک کی زندگی میں اتنا "قابل دید" نہیں ہوتا جتنا اس کے مرنے کے بعد

؎ سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے!

علی الصباح بعد نمازِ فجر کلام پاک کی تلاوت کر رہا تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ پانی کی مشین چلانے والا تھا۔ معلوم ہوا رات کو پانی نہیں آیا اور "زمین دوز ٹینک" خالی پڑا ہے اس لئے پانی نہیں چڑھایا جا سکتا۔ یہ جمعہ کا دن تھا۔ کتاب اللہ کو جہاں چھوڑا تھا وہاں سے دوبارہ پڑھنے بیٹھا۔ ذرا دیر میں بجلی چلی گئی۔ اندھیرا ہو گیا اور پنکھا بھی بند۔ یعنی پانی اور روشنی اور ہوا، زندگی کی ابتدائی تینوں ضروریات القط! یہ عروس البلاد کراچی کا حال ہے۔ اور پہلا تجربہ نہیں۔ دیکھنا چاہیے دیہات میں بجلی پہنچ کر کیا گل کھلاتی ہے!

حیف کہ ہمارے ہاں قاعدے کی پابندی کرنے والے پر انگلیاں اٹھتی ہیں۔

عید قرباں کے موقع پر بیشتر سنت ابراہیمؑ ہی کا ذکر آتا ہے اور خدا کی راہ میں عزیز ترین متاع یعنی اپنی اولاد

کی قربانی دینے کے لئے حضرت کے بے چون و چرا بلکہ انتہائی ہنسی خوشی کے ساتھ آمادگی سے ہمیں اعلیٰ مقاصد کے لئے ایثار کا سبق سکھایا جاتا ہے۔ مگر حضرت اسمٰعیلؑ کا بھی تو ہم پر حق ہے۔ میرے خیال میں اسی تواتر سے، اگر اس سے زیادہ نہیں ہمیں موصوف کی بے عذر اور بلا پس و پیش فرماں برداری کا بھی تذکرہ کرنا چاہیئے۔ باپ کے فرمان اور اللہ کے حکم پر جس مستعدی اور جذبۂ ایمان و وفاداری سے اس نے اپنا سر تسلیم خم کر دیا، کیا اس کی مثال ـــــ کسی عہد اور مذہب کی تاریخ میں مل سکتی ہے؟ موجودہ دور کے نوجوانوں کی عام بے راہ روی اور اپنے قابلِ احترام بزرگوں اور اپنی منفرد روایات سے بغاوت کے پیشِ نظر تو حضرت اسمٰعیلؑ کی مثال کے بار بار اُن کے سامنے لانے کی اور بھی ضرورت ہے۔ تعجب ہے کہ مسئلہ کے اس پہلو پر ہمارے ارباب فکر کی نظر بہت کم گئی۔ مفکرِ اسلام علامہ اقبال کی شخصیت تھی جن کی نظر سے یہ مسئلہ اوجھل نہیں ہو سکا کیا خوب فرمایا ہے ؎

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیلؑ کو آدابِ فرزندی!

میں سمجھتا ہوں اس شعر میں مسئلہ زیر بحث کے جملہ متعلقہ پہلو آگئے ہیں۔

امریکی اور برطانوی فلموں میں اعلیٰ معیار کی اداکاری کا ذکر تھا اور اس امر پر افسوس کا اظہار کیا جا رہا تھا کہ ہمارے ہاں کی فلموں میں وہ بات نہیں پیدا ہو سکی۔ عرض کیا گیا کہ جو ازلی ایکٹر ہوں اور تصنع جن کا لازمۂ حیات ہو اُن کے ساتھ دنیا کا کوئی ملک بھی کیوں نہ ہو کیونکر مقابلہ کر سکتا ہے ـــــ

ابراہیم باوانی مرحوم

آخر ۱۹۴۹ء تھا یا ۱۹۵۰ء کا آغاز جب عبدالحمید مرحوم، ڈپٹی کمشنر کراچی سے تعلقات کی بناء پر راقم الحروف محکمہ بحالیات کراچی کی ملازمت سے مستعفی ہوگیا صوبوں سے ہجرت کرکے پاکستان آنے والے افسروں کے لئے ——— وہ زمانہ بڑی آزمائش کا تھا چھوٹی چھوٹی عصبیتیں سر ابھارتی تھیں، ایسے میں اسحاق عبدالدین مرحوم (خالد اسحاق، ایڈووکیٹ کے والد محترم اور ریٹائرڈ ڈپٹی کمشنر کراچی) نے مجھکو گھر بلایا اور اپنے ساتھ لے جاکر اپنا بیٹا کہہ کر، سندھ و کراچی کے صنعتی علاقے (سائٹ) کی باوقار اور خوش حال عاملہ خدمت معتمدی و صدر نظامت انتظامی پر میرا تقرر کرادیا، ملک کے جتنے بڑے بڑے صنعت کار تھے ان سب سے تعارف ہونے کا اور ان کی خدمت کرنیکا پہلا موقعہ وہیں ملا، ولیکا، زیب تن، باوانی، حبیب، آدم سیٹھ، آدم جی، نیشی، پاکستان ڈائیکو والے، جنرل موٹر والے، ان میں سے بیشتر کو وہیں سے جانا پھر کارپوریشن کی سربراہی کے دور میں بحیثیت رکن کراچی امپروومنٹ ٹرسٹ، راقم الحروف لانڈھی انڈسٹریل ایریا کی مشاورتی کمیٹی کا بھی رکن بنا تو احمد داؤد، محمد علی رنگون والا، میراں علی محمد دلوا بھائی وغیرہم سے شناسائی ہوئی۔

باوانی وائلن ٹیکسٹائل ملز کے معاملات کے سلسلے میں دن رات کا واسطہ تو امین سیٹھ سے رہتا تھا لیکن باوانی خاندان کے سربراہ وقت سیٹھ عبداللطیف باوانی (جنکو سب چچا کہہ کر مخاطب کرتے تھے) سے راقم الحروف زیادہ مانوس تھا، اشتغال العلماء کے ذیل میں یا موتمر کے کسی اجلاس کے تعلق سے ایک مرتبہ انہیں کے ساتھ ابراہیم احمد باوانی مرحوم سے بھی ملاقات ہوگئی وہ اسی زمانے میں رنگون سے پاکستان کو منتقل ہوئے تھے ہم خیالی و ہم مشربی کے باعث نیز مولانا ظفر احمد انصاری کی ہم نشینی و ہم جلیسی کی بناء پر جلد ہی ان سے بے تکلفی اور اخلاص کے رشتے استوار ہوگئے۔ جنکو مدت العمر انہوں نے بڑی خوش خلقی و خوش اسلوبی سے نبھایا، متعدد مختلف اداروں میں ہم دونوں نے رفقاء کی حیثیت سے کام کیا، جمعیت الفلاح موتمر عالم اسلامی، جمعیۃ العربیہ نیز بعض دیگر ادارے، ہر جگہ اُن کا برتاؤ احترام و اخلاص کا حامل اور ان کا تعاون و مشورہ تجربہ کاری اور تعمیر پسندی کی جانب مائل رہا۔ راقم الحروف نے جب اسلامک آرڈر کی اجرائی کا قصد کیا تو ابراہیم باوانی مرحوم پہلے دوست تھے جس نے لبیک کہا اور سالانہ بنیاد پر اشتہار کی منظوری دے کر عملاً ہاتھ بٹایا۔ وہ کیا تھے اور کیسے تھے اسکو صلاح الدین صاحب مدیر جسارت کے قلم معجز بیاں سے سنئے جنہیں تحریر کو تقریر دل پذیر میں ڈھالنے کا گر بھی آتا ہے۔

"پاکستان کی صنعتی و کاروباری دنیا اور علمی، دینی اور تبلیغی حلقوں میں یکساں معروف و مقبول شخصیت الحاج ابراہیم باوانی بھی اس عارضی زندگی کا مرحلہ مکمل کر کے دارفانی سے اس ابدی زندگی اور دارالبقا کی جانب کوچ کر گئے، جس کی طرف ہم سب کچھ شعوری اور کچھ لاشعوری طور پر کھنچے چلے جا رہے ہیں۔"

الحاج ابراہیم باوانی، ان لوگوں میں سے تھے جنہیں اس دنیا کا بھی ہوش تھا اور عقبیٰ کا بھی پورا احساس و شعور، انہوں نے دنیا بھی کمائی اور اپنی آخرت بھی بنائی، وہ حقیقتاً بڑے سرمایہ دار تھے، دنیا کی دولت بھی خوب کمائی اور دین کی دولت بھی خوب سمیٹی، ان کی دولت کی تجوری سے متصل علوم کے خزانوں کی الماریاں اور دامن قلب و نظر میں ایمان و عمل، تعلیمی و تبلیغی خدمات اور رفاہی و فلاحی سرگرمیوں کا وسیع سرمایہ بھی موجود رہتا میں ان سے اسی سرمایہ علم و ایمان کے حوالے سے متعارف ہوا۔

ابراہیم باوانی مرحوم سے میری پہلی، زندگی بھر اور زندگی کی آخری ملاقات ہمیشہ کسی نہ کسی علمی مجلس میں ہوئی مسلم ممالک میں افریقہ، یورپ اور امریکہ میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت، اس کے عملی نفاذ کی کوششوں میں معروف اور اس کے لئے علمی و تحقیقی کام کرنے والا شاید ہی کوئی ایسا ادارہ اور تنظیم و جماعت ہو جس سے ان کا کسی نہ کسی حیثیت میں ربط و تعلق نہ رہا ہو سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کو تو چھوڑیئے، شاید ہی کوئی علمی شخصیت ان ہمہ گیر رابطوں اور علماء سے اشتراک و تعاون کے معاملہ میں ان کی ہم پلہ ہو، وہ رابطہ عالم اسلامی، موتمر عالم اسلامی، اسلامک کونسل آف یورپ، اسلامک فاؤنڈیشن لیسٹر اور امریکہ کینیڈا، جاپان اور دیگر ممالک میں کام کرنے والے اسلامک سنٹروں سے بحیثیت رکن، ڈائریکٹر، سرپرست اور دوسری حیثیتوں میں منسلک رہے، برطانیہ میں تعلیمی اور تربیتی سرگرمیوں کے لئے المدینہ ٹرسٹ قائم کیا پاکستان میں اپنی والدہ کے نام پر بیگم عائشہ باوانی ٹرسٹ قائم کیا جس کے تحت عائشہ باوانی کالج، سکول اور پرائمری اسکول قائم ہوئے، ان تمام اداروں کی ایک بنیادی خصوصیت یہ رہی کہ ان میں پرائمری اسکول ہی سے قرآن کریم کی تعلیم ترجمہ کے ساتھ دینے کا اہتمام کیا گیا اور حکومت کے مقرر کردہ نصاب کو دینی رنگ کے ساتھ پڑھایا گیا۔ انہوں نے اپنے خاندان کی خواتین میں قرآن کی تعلیم عام کرنے کے لئے درس کے حلقے قائم کئے اور خواتین میں حفظ قرآن کا شوق ابھارا انہوں نے میمن برادری کو خالص کاروباری زندگی کے دائرے سے باہر لانے اور اس کے لئے علمی دنیا میں قدم بڑھانے کے امکانات پیدا کرنے کے لئے ورلڈ میمن فاؤنڈیشن کی بنیاد رکھی، وہ اس کے چیئرمین اور آخر وقت تک رہنما رہے کراچی ریلیف کمیٹی برائے افغان مہاجرین قائم کی اور اس کے ذریعے افغان مہاجرین کے لئے دواؤں، کپڑوں، خوراک اور دیگر ضروریات کی فراہمی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، وہ مولانا فضل الرحمن انصاری کے قائم کردہ ورلڈ اسلامک سنٹر ناظم آباد کی مجلس عاملہ کے رکن رہے۔ دارالعلوم کورنگی کی مجلس منتظمہ میں شامل رہے۔ جمعیت، فلاح اور جمعیۃ العربیہ کے رکن عاملہ رہے، تبلیغی جماعت کی طرح معاونت کرتے رہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کیسے وسیع المشرب مسلمان تھے۔ کسی ایک مسلک کے گروہ میں بند نہ تھے، ان کی دلچسپی، اسلام، عالم اسلام اور عام مسلمانوں کی خیر و فلاح سے تھی یہی وجہ ہے کہ انہیں ہر طبقہ خیال میں یکساں مقبولیت حاصل تھی، انہوں نے

مشرقی پاکستان میں بھی علمی اور تبلیغی اداروں کا جال پھیلایا ہوا تھا اور وہاں ہی میں وہاں دوبارہ ایک ٹرسٹ قائم کرکے تعلیمی خدمت کیں۔ بھارت میں بھی وہ دارالعلوم دیوبند سمیت تقریباً تمام معروف اداروں کی سرپرستی کرتے تھے۔ غرض مسلمانوں کا کوئی ایسا تعلیمی تبلیغی تحقیقی اور علمی ادارہ نہیں جس سے ان کا تعلق نہ ہو اور جس کے لئے ان کی تجوری کا منہ کھلا ہوا نہ ہو۔

ان کی خدمات کا دائرہ صرف مالی معاونت تک محدود نہیں تھا، انہوں نے خود کتابیں لکھ کر اور دوسروں کی مشہور کتابیں چھاپ کر اہم علمی خدمات بھی انجام دی ہیں انہوں نے انگریزی زبان میں پانچ کتابیں لکھیں "قومی ترقی کے لئے انقلابی حکمت عملی"۔ "معاشرتی و معاشی ڈھانچے کی تشکیل نو کی ضرورت"، "چند اخلاقی مسائل اور ان کے حل کی تجاویز"۔ "تعارف اسلام — پہلا اور آخری مذہب"۔ اور "اسلامی معیشت کے بنیادی اصول" ان کی طبع شدہ کتابیں ہیں اور چھپی کتاب "اسلام کا تصور ریاست" زیر طبع ہے ان کے ادارے عائشہ باوانی ٹرسٹ کے تحت ۴۰ سے زائد معروف کتابیں چھپیں اور بیشتر تبلیغی مقاصد کے لئے مفت تقسیم کی گئیں

ابراہیم باوانی مرحوم کوئی بین الاقوامی شہرت رکھنے والے اسکالر یا ادیب نہیں تھے۔ لیکن، انہوں نے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ توانائیوں، اس کی بخشی ہوئی علمی صلاحیتوں اور اس کی دی ہوئی دولت میں سے کسی چیز کو بچا کر نہ رکھا۔ ہر چیز کو خدمت اسلام اور خدمت مسلمین کی راہ میں خرچ کیا۔ وہ غیر متعصب ذہن کے نہایت کشادہ ذہن اور وسیع النظر انسان تھے پاکستان میں کوئی دوسرا سرمایہ دار اور صنعت کار ان کا ہم پلہ نظر نہیں آتا حصول علم اور فروغ علم کا بے پایاں شوق، مسلمانوں کی تعلیم و تربیت و فلاح و بہبود سے غیر معمولی دلچسپی اسلام کی خدمت میں معروف اداروں کی معاونت و سرپرستی نادار اور حاجت مندوں کی امداد، اہل علم کی قدر افزائی اور اپنی ذات ہی نہیں، اپنے اہل خاندان پر بندگی رب کے تقاضوں کا عملی نفاذ ایسی صفات ہیں جو ابراہیم باوانی مرحوم کو اس دنیا میں ہمیشہ سربلند رکھیں گی اور آخرت میں ان کے رب کی خوشنودی کا ذریعہ بن کر انہیں ابدی زندگی کی بہترین نعمتوں سے ہم کنار کریں گی۔ اس سے بڑھکر ایک مسلمان کی تمنا اور کیا ہو سکتی ہے؟

ابراہیم باوانی مرحوم نے اس دنیا میں اپنی ہر تمنا پوری کر لی اب وہ ابدی سکون کی آغوش میں اس لمحہ کے منتظر ہیں جب بقول علامہ اقبال سے

خدا اپنے بندے سے خود پوچھے ، بتا تیری رضا کیا ہے۔

۱۲۔ ساجد بھائی

امیر مینائی رح تینوں بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے، بڑے تھے مفتی طالب حسن مغفور جن کا نام تاریخ ادب میں، حضرت امیر رح کے حوالے سے نواب یوسف علی خاں و کلب علی خاں کے دور کے سربراہ دارالقضا، رام پور کی حیثیت سے محفوظ ہے، منجھلے بھائی کا نام عنایت حسین تھا، ان کے احباب میں کسی گندم نما جو فروش نے شعبان کی کسی آخری تاریخ کو مجمع احباب میں ان کو شرمندہ کرنے کے لئے اپنی طرف سے یہ اعلان کر دیا کہ اب کے رمضان میں شیخ صاحب بھی محراب پر کھڑے ہوں گے، مرحوم، مُعلَن کے "خبث باطن" سے باخبر تھے اس لئے ذات باری پر بھروسہ کرکے اعلان کی تصدیق کی اور انتیسویں شب تک سنا کے قرآن پورا کر دیا، دن میں پورا پارہ یاد کر لیتے اور عشاء کے ساتھ سنا دیتے

اسلئے "حافظ عنایت حسین مرحوم" کے نام سے مشہور ہوئے۔

ساجد حسین مینائی جنکو عزیز و اقارب اور احباب سب کے سب چھوٹے (ساجد بھائی) کہتے تھے انہیں حافظ عنایت حسین مرحوم کے پوتے تھے، عمر میں مجھ سے دس بارہ برس بڑے تھے اور میرے بچپن (اُن کی نوجوانی) کے زمانے میں رام پور کی محدود دنیا تمدنی و شہری زندگی کی روح رواں تھے، میونسپلٹی ٹینس کلب (رؤسا و عمائدین بھی یہیں ٹینس کھیلنے آتے تھے) کے ہر دلعزیز سکریٹری، ٹینس کے چیمپئن، ہاکی اور کرکٹ دونوں کی فرسٹ الیون کے ممبر، فٹ بال کھیلنے میں نمبر اول، فائنلوں پر باجا کے فرمائشی ترانے گانے والی پارٹی کے مستقل سربراہ، آموں کی فصل میں باغوں میں دعوتیں جمانے والے گروہ کے سرخیل، عید بقرعید کے میلوں میں سب کے آگے، محرم کے مہندی اور ماتمی جلوسوں کی سیر کو نکلنے والی بھیڑ کے قائد۔ بڑے سرکاری افسران بشمول کوتوال شہر اور سکٹر میونسپلٹی سے لے کر قاضی صاحب تک، سب سے یاد اللہ اور صاحب سلامت! غرض کہ ساجد بھائی کو سب جانتے اور مانتے تھے — تعلیم معمولی تھی اور مشغلہ خوش پوشی و خوش باشی کے علاوہ معمولی تجارت اور عطاری (یونانی ادویہ سازی و فروخت) تھا، دکان پر لیکن ان کے فیز منش چھوٹے بھائی واجد حسین مینائی بیٹھتے تھے، یہ تو اپنی میل ملاپ اور رسوخ کی بناء پر --- CONTACT MAN تھے۔ باپ اور بڑے بھائی ٹھیکیدار تھے، دوسرے بھائی انجینئر — محبتوں، شفقتوں کا اور سعادت مندیوں کا زمانہ تھا، پورا خاندان مل کر احاطہ مینائیاں میں ایک ہی جگہ رہتا تھا اسلئے بڑی عزت و آرام سے زندگی بسر ہوتی تھی۔ ہماری شاخ حیدر آباد چلی گئی تو ساجد بھائی نے کانپور کے ایک خوشحال کاروباری گھرانے میں شادی کر لی، پاکستان بنا تو ہم سب دکن سے کراچی آ گئے، ساجد بھائی کی شاخ کے بھی بیشتر افراد یہیں منتقل ہو گئے ساجد بھائی کو لیکن کانپور والوں نے روک لیا، ۵۸ء میں جب میں رام پور گیا تو بھابی بچوں سے ملاقات ہوئی میری ترغیب پر سادہ منتقل ہونیکا تہیہ ہونے لگا تو بھابی بیمار ہو گئیں اور ساجد بھائی رام پور کے ہو کر رہ گئے — زمین و آسمان، زمان و مکان کے ساتھ رام پور بھی بدل گیا، اُجڑ گیا لیکن وہ نہیں بدلے، پچیس برس کے بعد آغاز ۸۲ء میں، میں دوبارہ رام پور گیا تو بھابی کی تو آخری حالت تھی لیکن ساجد بھائی کو بجز اس کے کہ بوڑھے اور کمزور ہو گئے تھے، بالکل ویسا ہی پایا مزاج و مذاق میں سر مو فرق نہیں آیا تھا وہی رچی ہوئی محبت اور شفقت، وہی ہنسنے بولنے کا مشفقانہ اور بے تکلفانہ انداز — کرید کرید کے سب دوستوں، عزیزوں، خرد و کلاں سب کی خیریت و حالات پوچھتے رہے، مجھ سے کہا کہ تمہاری بھابی کی طبیعت ذرا سنبھل جائے تو اسمٰعیل میاں ایک دفعہ جنکو پاکستان دکھا دو اور سب سے ملا دو — بس! واپس آ کے میں نے ان کی بیٹی داماد کو یہ پیغام پہنچایا وہ بخوشی اس پر آمادہ ہو گئے اور تیاریاں کرنے لگے لیکن جون ۸۲ء میں بھابی اللہ کو پیاری ہو گئیں اور غالباً انہیں کی جدائی کے صدمے سے لاچار ہو کر اکتوبر میں وہ خود بھی ان سے جا ملے بڑی محبت و شفقت والے بھائی تھے اللہ تعالیٰ ان کو جنت نصیب کرے اور ان کے پس ماندگان کو خاص کر میاں امین علوی اور انکی بیگم کو صبر جمیل عطا کرے۔ یغفر اللہ لہٗ ——— تسنیم مینائی

خسروی

"مولانا جان محمد بھٹو مرحوم کے نسلی روابط"

"مسرتاج التواریخ" مؤلفہ منشی عاشق علی خاں ناطق گلاؤٹھی، مطبوعہ ۱۳۲۲ ہجری کے مندرجات کی رُو سے "پنوار" (بمعنی سنوار) گوت کے راجپوتوں کے مورث اعلیٰ راجہ پرمار کے اخلاف میں مشہور راجہ بکرماجیت عرف بکرم کی اولاد میں راؤ رانڈ (یا رانا) ست ۱۴۰۰ بکرمی میں جب اپنے باپ کلیان سنگھ کی گدی پر بیٹھا تو اس نے اپنا مستقر رہتک سے پانچ کوس جنوب مغرب میں واقع موضع سدنیرہ سے موضع بھٹو اکبر پور عرف بھٹو منتقل کر لیا۔ راؤ رانڈ کے بعد اسکی دو بیویوں سے بارہ بیٹوں میں سے رانا گدی نشین ہوا۔ پھر اس کے تین بیٹوں میں سے بڑا بینی پال باپ کا جانشین ہوا۔ بینی پال کے بعد اسکے چار بیٹوں میں سے راؤ آبھا کو گدی ملی۔ پھر راؤ آبھا کی گدی اس کے دو بیٹوں میں سے اہر رانا کو پہنچی۔ پھر اہر رانا کے تین بیٹوں میں سے بیرم باپ کا جانشین ہوا۔ پھر بیرم کے چار بیٹوں میں سے ہان گدی نشین ہوا۔ ہان کے دو بیٹے تھے، بڑا راؤ رانا اور چھوٹا میگھو چند —— راؤ رانا نے بوجوہ باپ کی گدی قبول نہیں کی تو میگھو چند باپ کا جانشین ہوا۔ اس وقت تک اس خاندان کا مستقر موضع بھٹو (بھٹو اکبر پور) ہی تھا۔ لیکن راؤ رانا باپ کی گدی مسترد کر کے مع اپنے متعلقین و متوسلین کے موضع بھٹو سے موضع لاہلی منتقل ہو گیا۔ بعد ازاں میگھو چند نے بھی لاہلی کو ہی اپنی راجدھانی بنا لیا۔ اسطرح پنواروں کا یہ خاندان دونوں مواضعات (بھٹو اور لاہلی) اور انکے ملحقات میں منقسم ہو گیا میگھو چند کا چوتھا بیٹا اور جانشین، راؤ رتن ہی پنواروں میں پہلا فرد تھا جسے فیروز شاہ تغلق کے عہد میں حضرت نظام الدین اولیا محبوب الٰہی علیہ الرحمۃ کے ہاتھ پر مع اپنی آل اولاد اور رشتہ داروں کی اکثریت کے، مشرف باسلام ہونے کی توفیق اور سعادت نصیب ہوئی اور اسکا اسلامی نام معزالدین رکھا گیا۔ اُس وقت تک راجہ کلیان سنگھو ابن ملک دیو سے راؤ رتن یعنی معزالدین تک ۲۳۰ برس گزر چکے تھے۔

راؤ رانا اور میگھو چند، دونوں بھائی مع اپنے گھرانے کے، جب لاہلی منتقل ہو گئے تو پنواروں کے جو خاندان موضع بھٹو میں رہ گئے تھے ان کے مختلف افراد اور گھرانے وقتاً فوقتاً تلاش معاش کے لئے مشرقی و مغربی پنجاب، دہلی کے پنجاب سے ملحقہ علاقوں اور سندھ کے اضلاع میں منتقل ہوتے رہے۔ انہیں میں سے ایک خانوادہ وہ بھی تھا جو "نہ جانیں کہاں

کہاں ہوتا ہوا بالآخر ضلع لاڑکانہ میں آباد ہوا۔ کیونکہ اس خانوادہ کا جدّی تعلق پنجاب کے مذکورہ بالا موضع بھٹو سے تھا، لہٰذا شناخت اور امتیاز کے لئے اس کے افراد کے ناموں کا لاحقہ بھٹو ہو گیا۔ میری نظر سے اب تک کوئی ایسا معتبر قدیم تاریخی ماخذ نہیں گزرا جس سے یہ معلوم ہوتا کہ پنجاب کے ان پنواروں کا وہ کون سا شخص تھا جو سب سے پہلے مع اپنے خاندان سندھ کے اس علاقہ میں آکر آباد ہوا، موضع بھٹو سے کب نکلا، کہاں کہاں ہوتا ہوا یہاں پہنچا، سندھ کے اس مخصوص علاقہ کو سکونت کے لئے کیوں منتخب کیا، اسکا ذریعہ معاش کیا تھا اور اس کے گھرانے کا کون سا فرد سب سے پہلے کہاں اور کب مسلمان ہوا؟۔ آیا راؤ رتن یعنی معزالدین کے ساتھ ہی پنواروں کے اس بھٹو خانوادہ کا جدِ اعلیٰ بھی مسلمان ہو گیا تھا یا اس کے بعد کسی زمانے میں؟۔ کوئی صاحب کسی مستند قدیم تاریخی ماخذ کے حوالہ سے معتدبہ معلومات فراہم کر کے اس تاریخی تدقیق میں میری اور اس تحریر کے قارئین کی علمی مدد فرمائیں تو ممنون ہوں گا۔

توضیحاً اس ضمن میں یہ اضافہ کرنا بے محل نہ ہو گا کہ اگر پنواروں کا شجرۂ نسب مذکورۂ صدر راجہ پسدر اسے شروع کیا جائے تو راجہ بکرماجیت کا نام ۱۳۲ واں، راؤ رانبۂ کا ۱۵۸ واں اور راؤ رتن یعنی معزالدین کا ۱۶۶ واں ہے۔ اس تحریر میں دلچسپی لینے والوں کی معلومات کے لئے یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس شجرہ میں ۱۵۶ واں نام مانک دیو ہے جسکی دو بیویاں تھیں۔ ایک بیوی موسومہ کملا دے رانی سے جو دس بیٹے ہوئے وہ تو جدّی ریاست "دھاری" میں رہے۔ لیکن دوسری بیوی کے چار بیٹوں میں سے بڑا بھوانی سنگھ اور چھوٹا کلیان سنگھ (راؤ رنتۂ مذکورہ بالا کا باپ) ہریانہ منتقل ہو گئے اور اُس علاقہ کے پنواروں کے جدِّ اعلیٰ ہیں۔ بھوانی سنگھ تو گوہانہ (ضلع رہتک) میں آباد ہوا اور اسکی اولاد چودھری کہلاتی ہے اور چھوٹے بھائی کلیان سنگھ عرف کالو (جسکا نام شجرہ میں ۱۵۷ واں ہے) نے پہلے تو ہریانہ میں موضع کالوہ آباد کر کے اسے اپنا مستقر بنایا پھر وہاں سے موضع شدینہ منتقل ہو گیا، جہاں سے اس کے بعد اسکا بیٹا راؤ رانبۂ موضع بھٹو جا کر آباد ہوا، جیسا کہ اس تحریر کے آغاز میں ذکر کیا گیا ہے۔ شجرہ میں ۱۶۸ واں نام راؤ پرتاب (نبیرۂ راؤ رتن) کا ہے۔ اسی نے سب سے پہلے کلانور (ضلع رہتک) کو اپنا مستقر بنایا تھا، جسکی بناء پر اسکی اولاد کے افراد راؤ کہلاتے ہیں۔ راؤ پرتاب کی پانچویں پشت میں اور شجرہ میں ۱۷۲ واں نام راؤ بلّو کا ہے جس کے بڑی بیوی سے جو تین بیٹے ہوئے ان کی اولاد کلانور کا "بڑا پانا" اور چھوٹی بیوی سے جو چھ بیٹے ہوئے ان کی اولاد "چھوٹا پانا" کہلاتا ہے۔

پنواروں میں سے راؤ کہلانے والے راجپوت، علاوہ پنجاب کے اضلاع رہتک و حصار کے، صوبۂ یوپی کے

ملحقہ ضلع سہارنپور میں بھی کثرت سے آباد ہیں۔ چنانچہ اسی ضلع کے ایک موضع سکروڈہ کو حیدر آباد سندھ کے مشہور مسلم لیگی لیڈر نواب مظفر حسین خان مرحوم کے جدّی وطن ہونے کا شرف حاصل ہے، جہاں سے ان کے پر دادا راؤ امداد حسین خان، یو۔پی کے ضلع بلند شہر کے موضع داؤ پور میں آباد ہوگئے تھے، جو انکی پر دادی کو جہیز میں ..... (لال خانی راجپوتوں کی مشہور ریاست پہاسو سے) ملا تھا۔ نواب مظفر حسین خان مرحوم کے انتقال پر بعض حضرات نے اخباری تحریروں میں انہیں لال خانی راجپوت لکھا تھا جسکی تردید میں میری مفصل تحریر شائع ہوئی تھی جس میں وضاحت کی گئی تھی راؤ امداد حسین خان اور انکے بیٹے راؤ احمد حسین خان اور ان کے بیٹے راؤ ظفر حسین خان اور پھر ان کے بیٹے نواب مظفر حسین خان مرحومین ان سب کے رشتے لال خانیوں سے بوجہ داماد ہونے کے ہیں، پدری یا مادری رشتہ کوئی نہیں ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ نواب مرحوم اور ان کے اسلاف کو تاریخی حقائق کے خلاف، بجائے پنواروں کے لال خانیوں میں خواہ مخواہ شامل کرنے سے ان کی کیا عزت افزائی مقصود ہے، جبکہ میری نظر میں بہ نسبت لال خانیوں کے پنوار زیادہ مقتدر اور معزز ہیں۔ اسکی وجہ یہ کہ اول تو یہ بکرما جیت جیسے چکرورتی راجہ کی اولاد ہیں جب کہ لال خانیوں کا سلسلہ نسب راجہ لال سنگھ الملقب بہ لال خان سے شروع ہوتا ہے جو اکبر کے عہد میں ڈکیت (ڈاکو) اور منصب دار تھے۔ دوسری وجہ یہ کہ پنواروں کے مورث اعلیٰ لال خان (جو ہندو ہی تھا) کے لڑکے راجہ سالباہن نے ... معزالدین کے برسوں بعد عہد جہانگیری میں حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ یوں پنوار راجپوت دینی اعتبار سے بھی لال خانیوں پر سبقت رکھتے ہیں اور دنیاوی وجاہت کے اعتبار سے بھی بوجہ راجہ بکرما جیت کے اخلاف ہونے کی .... زیادہ معزز ہیں۔ راجہ بکرما جیت کی نسل سے کسی فرد کو لال سنگھ (عرف لال خان) کی نسل کا فرد بتانا تو اس کی عزت افزائی نہیں بلکہ عزت گرائی ہے لیکن نہ جانیں تاریخ سے نابلد حضرات کیوں اسپر مُصر ہیں جبکہ نواب مظفر مرحوم نے خود کو کبھی لال خانی نہیں بتایا۔ اب ان کے نادان دوستوں نے اسمیں بھی ان کی عزت افزائی سمجھ لی۔

برسبیل تذکرہ اس ضمن میں یہ بھی عرض کرنا ہے کہ مرقومہ بالا تاریخی حقائق "پنوار راجپوتوں کا ایک سندھی خانوادہ" کے عنوان سے میں نے ۱۷ اگست ۸۲ء کو ایک بڑے روزنامہ کو اشاعت کے لئے بھیجے تھے، جنہیں ابھی تک شائع نہیں کیا گیا ہے، حالانکہ اس تحریر میں اس راجپوت خانوادہ کے ماضی قریب میں مرنے والے یا فی الحال موجود کسی بھی فرد کا نام شامل نہیں ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ یہی روزنامہ اس خاندان کے ایک ایک فرد کا ذکر ہر اشاعت میں دس جگہ شہ سرخیوں اور تصاویر کے ساتھ کیا کرتا تھا لیکن اب اسکی صحافتی جرأت و دیانت کا یہ حال ہے کہ اس

پورے قبیلہ پر اگر کوئی تاریخی تدقیق بھی حوالہ قلم کی جائے تو اشاعت حرام سمجھتا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ موجودہ ارباب اقتدار میں سے کسی نے ایسی قدغن لگا رکھی ہو کہ اس قبیلے کے محض ایک شخص کی وجہ سے اس خاندان کے متعلق کوئی علمی تحریر بھی شائع نہ کی جائے۔ لیکن بات یہ ہے کہ ہر زمانہ میں شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار ضرور ہوتے ہیں اور خصوصاً صحافت میں تو اب یہ روایت ہی ہوگئی ہے۔ خسروی

شمارہ اگست ۶۶ء صفحہ ۱۲ کے کالم ۲ میں "شب اقراء" کا آخری بند، جو سہواً کتابت سے رہ گیا تھا مکرر شائع کیا جاتا ہے۔ اسی طرح کالم نمبر ۱ میں "روز فرقان" کے پانچویں بند کا صرف ایک شعر شائع ہوا ہے اور چھٹا بند پورے کا پورا رہ گیا یہ دونوں بند بھی مکرر شائع کئے جاتے ہیں۔

"شب اقراء"

اُس ایک رات کے پیغامبر ہیں گرم سفر
جنونِ منزل حق میں دہکتی راہوں پر
جہاں سے گزرے، اجالے بکھیرتے گزرے
جہاں بھی پہنچے، لٹا دی متاعِ فکر و نظر
نویدِ صبح ہر اک رات کو سناتے ہیں
ہر اک اندھیرے کو دیتے ہیں روشنی کی خبر
وہ نور زادے، کہ جن پر ہو خسروی کا سلام

"روز فرقان"

(۵) اس ایک دن کے طفیل آج تک اجالا ہے ٭ جہاں میں حق کا اسی دن سے بول بالا ہے
زبدر تا بہ فلسطین، مسلسل ایک ہی دن ٭ ہر ایک صبح اُسی دن کا اک حوالا ہے
وہ ایک دن، کہ ہے سبحان نورِ والاعلیٰ

(۶) سلام خسروی اُس دن کے ہر اجالے پر ٭ سلام خسروی اُس روز کے اُجالے پر
شبِ سیاہ کا باقی اک آسرا ہے وہی ٭ سلامِ خسروی اس روشنی کے پالے پر
کوئی اندھیرا مقابل نہ جس کے ٹھہر سکا

خسروی

چاندنی سمٹ کر ہوٹل جبیس بن گئی!
HOTEL
Jabees